شعور و آگہی

امام عبید اللہ سندھیؒ

شعور و آگہی

افادات

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ

www.rahimia.org

رحیمیہ مطبوعات

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئنز روڈ، شاہراہِ فاطمہ جناح، لاہور

Ph:042-6307714 , 6369089

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

- کتاب: شعور وآگہی
- افادات: امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ
- مرتب: سید مطلوب علی زیدی
- اشاعت: مئی 2009ء
- کمپوزنگ: سید نفیس مبارک ہمدانی
- مطبع: علی فرید پرنٹرز، لاہور
- اہتمام: ناظم ''رحیمیہ مطبوعات''
- برائے: ''رحیمیہ مطبوعات''، کوئینز روڈ، لاہور
  Ph:042-6307714 , 6369089
- قیمت:

www.rahimia.org

تقریظ

حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ

خلیفہ مجاز

حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس اللہ سرہ العزیز

وجانشین

حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوری نوراللہ مرقدہ

دینی فہم و بصیرت اور عقل و شعور ہر دور کا اہم ترین تقاضہ رہا ہے، قرآنی تعلیمات، انبیاء علیہم السلام کی سیرت و کردار اور اکابر اولیاء اللہ کے ملفوظات میں اس پر بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ بالخصوص آج زوال کے دور میں جب کہ ظالمانہ نظام کے پیدا کردہ ماحول میں نوجوان نسل کو گمراہ کر کے دین سے دور کیا جا رہا ہے، اور عقل و خرد سے بیگانہ کر کے دنیا و آخرت کی تباہی کا سامان پیدا کیا جا رہا ہے۔ بڑی ضرورت ہے کہ اکابر اولیاء اللہ کی سچی تعلیمات کا تعارف نوجوان نسل کے سامنے رکھا جائے۔ خاص طور پر حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ کی وہ جامع تعلیمات جو دینی عقل و شعور پیدا کرنے اور دنیا و آخرت کی کامیابی کا جامع نظریہ اور نظامِ فکر و عمل پیش کرتی ہے، کا تعارف بڑا ضروری ہے۔

اس دور میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بہترین شارح امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت کے رکن رکین ہیں۔ اور ان کے فکر و عمل کے صحیح وارث ہیں۔ زیر نظر کتاب میں مولانا سندھیؒ کے ان علوم و افکار کو جمع کیا گیا ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی تعلیمات سے خوشہ چینی پر مبنی ہیں۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو نوجوان نسل تک پہنچانے والوں کے اس جذبہ کو قبول کرے اور نوجوانوں کو اس سے راہنمائی حاصل کرنے کی توفیق دے۔

سعید احمد رائے پوری ۱۲ مئی ۲۰۰۹ء

فہرست

نمبر شمار		عنوان	صفحہ نمبر
1	تقریظ		3
2	حرفِ اوّل		5
3	ابتدائیہ		7
4	مقالہ نمبر (۱):	انسانیت کے بنیادی اخلاق	13
5	مقالہ نمبر (۲):	خُدا پرستی، انسان دوستی	22
6	مقالہ نمبر (۲):	وحدتِ انسانیت	29
7	مقالہ نمبر (۴):	نظریہ تمدُّن	34
8	مقالہ نمبر (۵):	غلبۂ دین کی عصری اہمیت	43
9	مقالہ نمبر (۶):	جہاد: انقلاب	51
10	مقالہ نمبر (۷):	قرآن کا اعجاز	55
11	مقالہ نمبر (۸):	تاثیرِ قرآن	63
12	مقالہ نمبر (۹):	حکمت عملی	67
13	مقالہ نمبر (۱۰):	تصوف	70
14	مقالہ نمبر (۱۱):	ارتفاقات	74
15	مقالہ نمبر (۱۲):	تاریخ اسلام کا اجتماعی نقطہ نظر	95
16	مقالہ نمبر (۱۳):	تاریخ اسلام کا عہد اول	105
17	مقالہ نمبر (۱۴):	تاریخ اسلام میں قومی حکومتوں کا دور	116
18	مقالہ نمبر (۱۵):	شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک	137
19	مقالہ نمبر (۱۶):	انسانی اجتماعیت اور اقتصادیات	155

www.rahimia.org

باسمہٖ تعالیٰ

حرفِ اوّل

موجودہ دور اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ دورِ حاضر کے سیاسی سماجی اور معاشی مسائل کے حل کے لئے غور و فکر اور شعور و آگہی سے کام لیا جائے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس دور کے اجتماعی مسائل کے حل کے لئے ایک روشن نظامِ فکر و عمل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابوں میں دینی تعلیمات کے تناظر میں سیاسی، معاشی اور سماجی حوالہ سے اجتماعی مسائل کے حل کے لئے ایک جامع نظریۂ زندگی اور پُر جوش نظامِ فکر و عمل ملتا ہے۔

موجودہ دور میں اس حوالہ سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکارِ عالیہ کو متعارف کرانے میں امامِ انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی جدوجہد اور ان کا کردار بڑا اہم ہے۔ آپ نے برصغیر پاک و ہند کی آزادیٔ و حریت اور قومی سیاست کے میدان میں پچاس سال خدمات سرانجام دی ہیں اور پھر مسلسل غور و فکر اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابوں کے گہرے مطالعہ کے بعد شاہ صاحب کے افکارِ عالیہ کو دورِ جدید کے تقاضوں کے تناظر میں مرتب و مدون فرمایا ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''شعور و آگہی'' حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی کاوشوں پر مبنی اُن افکارِ عالیہ کے اقتباسات کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم و افکار کی اساس پر جدید اسلوب میں مرتب و مدوّن فرمائے ہیں۔ بلاشبہ یہ کتاب دورِ جدید کے سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کے حل کے لئے غور و فکر کے کئی نئے زاویے پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کا مقصد نوجوانوں کے سامنے روایتی اندازِ فکر کی بجائے شعور و آگہی کے نئے زاویوں کو پیش کرنا ہے۔ تاکہ ان کے سامنے دورِ حاضر کے سلگتے ہوئے اجتماعی مسائل پر بحث و مباحثہ اور سوچنے سمجھنے کے دروازے کھلیں۔ اور جمود و تنگ نظری کے بند پردوں کو

www.rahimia.org

کھول کر مسائل کے حل کرنے کی عقل و شعور پیدا ہو۔ یہ کتاب فتویٰ کی زبان میں نہیں لکھی گئی، بلکہ سوچنے سمجھنے اور مسائل کو نئے زاویے سے پرکھنے اور اس پر مکالمہ کرنے کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس لئے اس میں روایتی اندازِ فکر سے ہٹ کر کوئی چیز ہے تو وہ بحث و مباحثہ کے لئے ہے، جس پر غور و فکر کر کے حتمی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

اس کتاب کو آج سے تقریباً ۴۰ سال قبل جناب سید مطلوب علی زیدی صاحب نے اپنے چند احباب سے مل کر مرتب و مدون کیا تھا، اور ''شعور و آگہی'' اس کا نام رکھا تھا۔ اس طویل عرصہ میں اس کتاب نے سینکڑوں ہزاروں نوجوانوں اور فکر و شعور کے متلاشی علم دوست احباب کی تشنگی کو دور کیا ہے۔ اور سوچنے سمجھنے کے نئے انداز سے آگہی بخشی ہے۔ اور انہوں نے فکرِ فردا کا شعور حاصل کیا ہے۔ اور فکر و عمل کی تگ و تاز میں اس سے راہنمائی حاصل کی ہے۔

اب تک اس کتاب کے گیارہ ایڈیشن مختلف ناشروں کی طرف سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ بارہواں ایڈیشن ''رحیمیہ مطبوعات'' کی جانب سے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس ایڈیشن میں اس کتاب کی ترتیب میں جزوی تبدیلی کی گئی ہے۔ مقالہ نمبر ۱۵ ''قرآن کا انٹرنیشنل انقلاب'' کو ''تاریخ اسلام کا اجتماعی نقطۂ نظر اور قرآن کا انٹرنیشنل انقلاب'' کے عنوان سے مقالہ نمبر ۱۲ بنا دیا گیا ہے۔ نیز پوری کتاب میں ہر مقالہ کے آخر میں کتب کے حوالہ جات دے دیئے گئے ہیں، اور ضروری مقامات پر حواشی کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

''رحیمیہ مطبوعات'' کی جانب سے عمدہ اور شعوری کتابیں بہترین انداز میں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے، اس حوالہ سے یہ پہلی کتاب نذرِ قارئین کی جارہی ہے۔ انشاء اللہ اس کے بعد جلد ہی دیگر کتابیں بھی منظر عام پر آئیں گی۔ اس سلسلہ میں آپ کی تجاویز و آراء کا انتظار رہے گا۔ اُمید ہے کہ قارئین اس سلسلہ میں ضرور آگہی دیں گے۔

ناظم اعلیٰ

''رحیمیہ مطبوعات''

رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ لاہور

۱۵ مئی ۲۰۰۹ء

www.rahimia.org

باسمہٖ تعالیٰ

ابتدائیہ

جب کائنات ارضی تمام وسائل زندگی سے آراستہ ہوگئی تو خالق انسانیت نے انسان کو پیدا کیا اور اُصول فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے اس کو اپنی ہدایات سے نوازا۔ نہ صرف یہ، بلکہ پہلے انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو ہی شرف نبوت عطاء کرکے اس امر کی نشاندہی کردی کہ اللہ تعالیٰ کو انسانیت کا راہ ہدایت پر گامزن ہونا ہی مطلوب ہے۔

جوں جوں انسانیت اپنی ترقی کی منازل طے کرتی گئی ،وہ اُصول فطرت سے مستفید ہوتی رہی ۔اور جب شیطانی طاقتوں اور بدی کی قوتوں نے انسانیت کو راہ حق سے منحرف کرنے کی کوشش کی، تو اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے کسی اولو العزم انسان کو منصب رسالت عطا فرما کر انسانیت کو راہ حق پر چلنے کے لئے راستہ آسان کردیا۔یہ انبیاء اور رُسل جہاں ان غلط رسومات اور تحریفات کوختم کرنے کی جدوجہد اور کوشش کرتے جو اُصول فطرت پر گردوغبار بن جاتی تھیں، وہیں انسانیت کے ذہنی ارتقاء کو مدنظر رکھتے ہوئے روشن راستہ کی راہنمائی کرتے رہے ۔انبیاء علیہم السلام کا طویل سلسلہ اسی حقیقت کا عکاس ہے کہ انہوں نے اُصول فطرت کے مطابق انسانوں کو راہ حق پر چلنے کی نہ صرف تلقین وتبلیغ کی بلکہ اپنے پیروکاروں کو منظم کرکے صحیح نظام قائم کرنے کی بھی جدوجہد اور کوشش کی ۔

جن انبیاء ورسل علیہم السلام کے قصص قرآن حکیم میں مذکور ہیں،وہ واضح طور پر اس امر کے غماز (اشارہ کرنے والے) ہیں کہ انہوں نے ظلم ،ناانصافی ،حقوق غصب کرنے اور بدی کے نظام کے خلاف نہ صرف صدائے حق بلند کی، بلکہ وقت کے ظالموں کو سرنگوں کرکے انسانیت کو ظلم وزیادتی کے نظاموں سے نجات دلائی،اور اس جدوجہد میں کئی برگزیدہ پیغمبروں نے اذیت ناک سزائیں جھیلیں اور بعض نے تو جام شہادت بھی نوش کیا۔

جب انسانیت ذہنی ارتقاء کے اس مرحلے میں داخل ہوئی جس کو بین الاقوامیت کا آغاز کہا جاتا ہے تو خالق فطرت نے اس دور کی راہنمائی کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو

منتخب کیا جن کی نسبت قرآن حکیم میں ارشاد خُداوندی ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (میں تجھے نوع انسانی کا امام بناؤں گا) آپ نے بین الاقوامی دور کے آغاز پر انسانیت کی فطرتِ انسانی کے مطابق راہنمائی کی، اسی کے ساتھ آپ کو اپنے اردگرد موجود نظام سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا، اس کام کے لئے آپ نے دو مراکز قائم کئے، (۱) بیت المقدس، جہاں آپ نے اپنے صاحبزادے حضرت اسحاق علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت یعقوب علیہ السلام کے لئے مرکز قائم کیا، (۲) بیت اللہ الحرام مکۃ المکرمہ، جہاں آپ نے دوسرے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کے خاندان کے لئے مرکز قائم کیا۔ آپ کے بعد سب سے پہلے اس مشن کو لے کر چلنے والے بنی اسرائیل یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد تھی۔

چنانچہ اس سلسلے میں حضرت یوسف علیہ السلام نے نظام مملکت میں وہ کلیدی کردار ادا کیا کہ آج کے دور میں نظاموں کی نوعیت اسی حوالے سے جانچی جاتی ہے، یعنی معاشیات کے شعبہ میں وہ دور رس قدم اٹھائے کہ پوری قوم بھوک اور قحط کی آفات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکی۔ اس سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام نامی انتہائی نمایاں ہے کہ آپ نے اپنی قوم کے لئے محض اعتماد خُداوندی کے بل بوتے پر فرعون کے ظالمانہ اور جابرانہ نظام سے ٹکر لی اور بنی اسرائیل کو آزادی دلائی، نیز آپ نے اپنی قوم کی ان حرکات و اعمال پر صبر کیا جو اس میں فرعونی غُلامی کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھیں۔ علاوہ ازیں بنی اسرائیل کے سلسلۂ نبوّت میں حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا بھی نظامِ عدل کے قیام اور فاسد حکومتوں سے نبرد آزما ہونے میں روشن کردار ہے۔

بعد ازاں جب انسانیت کا ذہنی اور عملی ارتقاء، بین الاقوامی مرحلہ کے نقطۂ عروج پر پہنچا تو سید الکونین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بعثت کل انسانیت کی جانب ہوئی، آپؐ نے خود فرمایا بُعِثْتُ اِلَی النَّاسِ كَافَّةً (رواہ البخاری)، اس کے لئے آپ نے سب سے پہلے قریش کو تیار کیا، اور پھر قریش کی قیادت میں تیار ہونے والی جماعت صحابہ کے ذریعہ سے آپؐ نے انسانیت کی فلاح و بہبود کا بین الاقوامی نظام قائم کیا۔ اور اس کے لئے رسول اکرم ﷺ نے نہ صرف مکہ کے ظالمانہ نظام کو ختم کیا بلکہ مشرق و مغرب میں موجود قیصر و

www.rabitta.org

کسریٰ کے نظاموں کا خاتمہ بھی کر دیا۔

رسولِ خدا ﷺ نے توحید کے حقیقی مفہوم اور عملی تقاضوں کو نہ صرف واضح اور آشکارا کیا بلکہ پسماندہ افراد کو اپنی ہی قوم کے سرداروں سے نجات دلانے کی سعی و کاوش کی اور اس کی ابتداء افراد کی ذہن سازی اور ان پر مشتمل تنظیم بندی سے کی۔ چنانچہ مکی زندگی اسی حقیقت سے عبارت ہے۔ جاں نثار اور باشعور ساتھیوں کی جماعت قائم ہونے کے بعد ہی مدنی زندگی کا آغاز ہوا، جس میں اقوام کو ظلم و جور سے نجات دلانے کے عمل کی ابتداء ہوئی۔

اور یہ عمل خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ادوار میں بھی جاری ساری رہا۔ بلکہ آپ کا ایک مقصدِ بعثت یعنی قیصر و کسریٰ کی مغلوبیت، حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں ہی عملی طور پر پایۂ تکمیل تک پہنچا، اور یوں رسول اکرم ﷺ کے کئی مقاصد ان کی جماعت کے توسّط سے پورے ہوئے، اسی لئے مکمل دین "مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِی" (وہ ہے جس پر میں اور میرے صحابہؓ کے دور میں عمل ہوا) (رواہ الترمذی) سے عبارت ہے۔

خُلفائے راشدین کا عہدِ زرّیں اسلام کا مثالی دور ہے۔ تاہم ان کے بعد کا دور بھی اپنے کئی پہلوؤں کے لحاظ سے قابلِ اطمینان ہے۔ اور تاریخ کے اجتماعی نقطۂ نظر کے حوالے سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے نظام میں کوئی دور رس تبدیلی نہیں ہوئی اور جس تبدیلی کا مؤرخین ذکر کرتے ہیں وہ اس دور کے تقاضوں کا دوسرا نام ہے۔ کسی بھی دور کی سیاسی، معاشی اور سماجی صورت حال کا جائزہ اس دور کے تقاضوں کے پس منظر میں ہی لیا جاسکتا ہے۔ تاہم ان ادوار میں بعض نامناسب اور غیر پسندیدہ تبدیلیوں کے وُجود سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ دین کے حامل اہلِ حق طبقہ نے ہمیشہ اجتماعیت کے حوالہ سے ناپسندیدہ اُمور اور ناروا شخصی رَوِیّوں پر شدید مزاحمت کا اظہار کیا۔ ان حق گو آئمہ، علماء و مشائخ کو اس تنقید کی پاداش میں حکمرانوں سے زیادتیاں بھی سہنا پڑیں۔ بلکہ کئی نفوسِ قدسیہ کو اس راہ میں شہادت کی منزل سے بھی گزرنا پڑا، اور یہ ایک ایسی صفت و خصوصیت ہے کہ جس کا یورپ کے کلیسائی نظام میں کہیں نام و نشان تک نہیں ملتا، بلکہ اس کے برعکس یورپ کے پوپ، حکمرانوں کو اپنے مذہبی جنون و جمود کا آلۂ کار بنائے رہے، جس کی وجہ سے ہر نئی سوچ رکھنے والا شخص، جان ہتھیلی پر لئے پھرتا تھا۔ چنانچہ وہاں

جب شعور کی لہر آئی تو نہ بادشاہت خود کو بچا سکی اور نہ پاپائیت اپنا تسلط برقرار رکھ سکی۔ نتیجتاً عوام میں جمہوریت کے ساتھ ساتھ مذہب کے انکار کے جراثیم بھی سرایت کر گئے۔ چنانچہ آج کا یورپ مع ریاست ہائے متحدہ امریکہ لامذہبیت کا علمبردار ہے، جب کہ مسلمان اقوام میں بادشاہوں کے خلاف عوامی جدوجہد کا شعور، دین کے علمبردار اہل حق طبقہ نے دیا۔ چنانچہ ماضی قریب کے برعظیم ہند میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیتیں اس جدوجہد میں پیش پیش نظر آتی ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی دینی جدوجہد اس دور سے تعلق رکھتی ہے، جب بحیثیت نظام کے اہل ہند پستی کا شکار نہیں ہوئے تھے، تاہم فکری حوالے سے چند درباریوں سے مسلمانوں کے حق میں دور رس غلطیاں سرزد ہوئی تھیں، چنانچہ مجدد صاحبؒ کی فکری اصلاح اور موجود نظام کی خوبیاں عالمگیر کے دور میں مکمل طور پر ظاہر ہوئیں۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس دور میں آئے جب مسلمانوں کا نظام فرسودہ ہو چکا تھا۔ اس دور کا ڈھانچہ لبِ گور (قبر) کو پہنچ چکا تھا، دین حق قنوطی مذہب کی شکل اختیار کر چکا تھا اور دنیا بھر میں عنقریب ایک نئی تبدیلی کا سماج شروع ہونے والا تھا، چنانچہ آپ نے اپنے دور کے نظام کو سہارا دینے کے بجائے "فَکُّ کُلِّ نِظَام" (ہر فرسودہ نظام کو توڑ دینے) کا نظریہ دیا یعنی جاری نظام کو مکمل طور پر بیخ و بُن (جڑ) سے اکھاڑ دیا جائے اور اس کی جگہ عادلانہ اور فلاحی نظام قائم کیا جائے، اس سلسلے میں آپ نے جو سیاسی و معاشی اُصول پیش کیے، ان کی تفصیلات آنے والے صفحات میں قارئین ملاحظہ کریں گے۔

شاہ صاحبؒ نے محض نظریہ ہی نہیں دیا بلکہ عملی طور پر بھی کئی ایسے اقدامات کئے یا ان میں کلیدی کردار ادا کیا جو ان کے اعلیٰ نظریہ تک پہنچنے کے لئے بطورِ وسیلہ اور ذریعہ ضروری تھے، اور اس حقیقت سے کوئی دانش مند چشم پوشی نہیں کرے گا کہ نئے راستوں پر عمل بہر صورت تجدید کا متقاضی ہوتا ہے۔ نیز کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے سفر میں گردِ راہ سے بھی واسطہ ایک ناگزیر امر ہوتا ہے لیکن اس بناء پر مقاصدِ سفر آلودہ نہیں ہوا کرتے۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ نے نظریہ انقلاب پیش کرنے کے ساتھ ہی اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق حکمت عملی اپنائی اور اس سلسلے میں آپ کا احمد شاہ ابدالی سے رابطہ ہوا، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ

آپ کی دعوت پر یہاں کی غلط روش اپنانے والی مقامی طاقتوں پر حملہ بھی ہوا، اس طرح آپ نے اس دور کی سماجی ضرورت کے تحت اپنی انقلابی دعوت کے لئے اعلیٰ طبقوں کو بطورِ خاص مخاطب کرنا ضروری جانا اور یہی چیز آپ کی "عملیت" کی روشن دلیل ہے۔

افسوس کہ اس دور کے اعلیٰ طبقوں نے ان کی آواز پر کان نہ دھرا، جب کہ دیگر طبقات پہلے ہی غور وفکر کی صلاحیت سے عاری ہو چکے تھے، چنانچہ جسدِ سلطنت کے کمزور ہوتے ہی بدیشی جراثیم کا حملہ کارگر ثابت ہوا اور یوں برعظیم ہند، غلامی کا طوق پہننے پر مجبور ہوا، جس کے بعد تبدیلیِ نظام کی جدوجہد، جنگ آزادی میں تبدیل ہوگئی۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دے کر بیرونی طاقت کے خلاف جدوجہد آزادی کی فرضیت کا اعلان کردیا اور آپ کی نگرانی میں سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحیؒ نے اس حوالے سے جدوجہد اور کوشش کی، جو بالاکوٹ میں اپنی انتہا کو پہنچی، جب کہ شاہ محمد اسحاق دہلویؒ نے اپنے نانا شاہ عبدالعزیزؒ سے حاصل کردہ فکر ونظریہ اپنے شاگردوں میں منتقل کیا۔ چنانچہ ان کے فیض یافتہ اصحاب نے 1857ء کی جدوجہدِ آزادی میں شاملی کے میدان میں انگریز سامراج کا بھرپور مقابلہ کیا جو اگرچہ فوری طور پر بارآور نہ ہوسکا لیکن ہندوستان کی آزادی پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔

1857ء کے بعد اس دور کے سماجی تقاضوں کے مطابق تعلیمی حکمت عملی نے لے لی اور یوں حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی نگرانی میں دارالعلوم دیوبند کا آغاز ہوا، جس سے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ جیسے سپوت عالمی سیاست پر جلوہ گر ہوئے، جنہوں نے اپنے دور کے تقاضوں کو بھانپتے ہوئے محاذ آراء تعلیمی مرکز یعنی علی گڑھ کے نوجوانوں کو علماء حق کی صف میں برابر کا ساتھی بنانے کی پالیسی اپنائی، اور دوسری جانب برادرانِ اسلام اور برادرانِ وطن کے درمیان تعاون کو اپنی سیاسی حکمت عملی کا حصہ بنایا۔ نیز خلافتِ عثمانیہ کے تعاون سے برعظیم ہند کو آزادی سے ہمکنار کرنے کے لئے تحریک ریشمی رومال کی قیادت و رہنمائی کی اور یوں انگریزی سامراج کو ایک بار پھر علمائے حق کی جدوجہد کی گہرائی کا اندازہ ہوا۔ چنانچہ شیخ الہندؒ کو مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا عزیر گلؒ سمیت کئی احباب وتلامذہ کے ساتھ جزیرۂ مالٹا میں اسارت سے واسطہ پڑا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے مالٹا سے رہائی کے بعد عدم تشدد اور کل ہند بُنیاد پر قومی سیاسی جدوجہد کو متعارف کرایا۔ چنانچہ آپ کے افکار سے مولانا مفتی کفایت اللہؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ، حکیم محمد اجمل خاںؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا حسرت موہانیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا شوکت علیؒ، ڈاکٹر سیف الدین کچلوؒ، نواب وقار الملکؒ اور مہاتما گاندھی جیسی قومی اور بین الاقوامی شخصیات نے استفادہ کیا۔

ان حضرات میں سے ایک یعنی مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اپنے استاد شیخ الہندؒ کے حکم پر افغانستان کا سفر کیا۔ جہاں بیٹھ کر انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے سات سال جدوجہد اور کوشش کی اور اس کے بعد روس، ترکی اور حجاز جا کر وہاں ہونے والی سماجی اور انقلابی تبدیلیوں کا بغور مطالعہ کیا۔ اور قرآنِ حکیم، احادیث نبویہ اور امام شاہ ولی اللہؒ کے زاویۂ فکر سے دورِ حاضر کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا جائزہ لیا۔ اور دینی تعلیمات کی روشنی میں قوموں کی آزادی کے لئے ایک جامع انقلابی فکر و عمل مرتب کیا، اور پھر ۲۴ سالہ جلا وطنی کے بعد مارچ 1939ء میں ہندوستان آ کر امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار پر مبنی انقلابی فکر و عمل سے متعارف کرنے کی بھرپور جدوجہد اور کوشش کی اور کئی ادارے اور تنظیمیں قائم کیں۔

اس کتاب میں مولانا سندھیؒ کے افکارِ عالیہ کے ضروری اقتباسات جمع کر دیئے گئے ہیں، کتاب کے مندرجات پروفیسر محمد سرور مرحوم کی کتابوں کے علاوہ ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' مؤلفہ مولانا سید محمد میاںؒ اور ''شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات'' مؤلفہ پروفیسر غلام حُسین جلبانیؒ پر مبنی ہیں۔ یہ کتاب آج سے تقریباً چالیس سال پہلے ترتیب دی گئی تھی، اب ترتیبِ نو کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچانے کی سعی مشکور سرانجام دیں گے۔

سید مطلوب علی زیدی ۱۰ر مئی ۲۰۰۹ء

مقالہ نمبر (۱)

﴿انسانیت کے بُنیادی اخلاق﴾

انسان کو اس دنیا پر بستے کتنی ہی صدیاں ہو گئیں اور اسے ارتقاء کی موجودہ منزل تک پہنچنے میں کیا مراحل طے کرنے پڑے۔ اس طویل مدت میں انسانوں نے کئی تمدُّن بنائے بڑے بڑے فلسفوں کی بُنیاد رکھی، بے شمار علوم وُجود میں آئے۔ اخلاق و عادات کے نت نئے معیار بنے، انبیاء مبعوث ہوئے اور ان کی زبان سے خُدا تعالیٰ کے پیغامات اِن کے بندوں کو ملے، فلسفیوں اور حکیموں نے نئی نئی باتیں سوچیں۔ الغرض اب تک اتنے تمدُّنی، اخلاق، فلسفی اور دینی نظریے معرضِ وُجود میں آچکے ہیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے، ہر دور ایک نیا فکر لے کر آیا، ہر قوم نے یہ دعویٰ کیا کہ جو تمدُّن ان کا ہے ویسا تمدُّن نہ کسی کا پہلے تھا اور نہ آئندہ کسی کا ہوگا "اَنَاوَلَاغَیْرِیْ" (میرے سوا کوئی نہیں) کی صدائیں ہمیں ہر قوم کی تاریخ کے دورِ اقبال میں سننے میں آتی ہیں۔

بہر حال اس سے انکار نہیں کہ ہر قوم کی انفرادیت اپنی جگہ مسلم ہے اور ہر فکر نے اپنے اپنے زمانے میں اپنے لئے نئی فضاء بنائی۔ لیکن جس طرح انسان تمام وقتی، مکانی، عارضی اور ظاہری اختلافات کے باوُجود اصل میں سب ایک ہیں (خواہ کوئی آج سے دس ہزار سال پہلے کا غیر متمدّن انسان ہو یا اس زمانے میں وسطِ افریقہ کے جنگلوں میں بسنے والا حبشی یا آج کا ترقی یافتہ یورپین، جس طرح ان سب میں انسانیت کا ایک جامع نقطہ مشترک ہے اور گو لاکھوں برس کے ارتقاء نے ان کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے، لیکن جہاں تک اصل انسانیت کا تعلق ہے وہ اس میں اب بھی ایک دوسرے سے مشابہ ہیں اور ان میں بُنیادی طور پر کوئی فرق نظر نہیں آتا) بعینہٖ اس طرح ان گوناگوں اخلاقی نظریوں تمدُّنی اصولوں اور افکار وادیان میں بھی ایک گونا وحدت ہے، گو ارتقاء نے ان کو عجیب عجیب شکلیں دیں اور انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا، لیکن اس کے باوُجود ان تمام کے درمیان چند بُنیادی باتیں ایسی ہیں جو سب میں مشترک نظر آئیں گی۔ ظاہر بینوں (دیکھنے والوں) پر

ہمیشہ یہ حقیقت مخفی رہی اور وہ کنویں کی مینڈک کی طرح اپنی محدود دنیا اور اپنے طبقاتی فکر کو سب سے جُدا اور الگ سمجھتے رہے، اور انہوں نے اپنے ذہن کو باقی ذہن انسانی سے الگ تھلگ کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح پانی بہتے ہوئے دریا سے بے تعلق ہوجائے تو اس میں سڑانڈ (بدبو) پیدا ہوجاتی ہے اسی طرح فکری اور ذہنی علیحدگی نے ایسی قوموں کے دماغوں کو مفلوج کردیا ہے۔

جس طرح کائنات کی کثرت انسانی ذہن کو پریشان کردیتی ہے اور وہ کائنات میں اپنا صحیح مقام متعین کرنے کے لئے مجبور ہوجاتا ہے کہ وہ اس کثرت میں وحدت کا پتہ لگائے، اسی طرح صاحب نظر حکیم مظاہر انسانی کی ان رنگا رنگیوں میں جنہیں ہم کلچر اور فکر کا نام دیتے ہیں مشترک حقائق کی تلاش کرتا ہے، تاکہ وہ عالمگیر انسانیت کی چھپی ہوئی حقیقت پاکر اپنے تمدّن کی بنیاد ان اُصولوں پر رکھے جو ساری انسانیت پر جامع ہوں، تاکہ قوم کا فکر اصل سرچشمۂ حیات سے بے تعلق نہ ہو، اور اس کا ذہن ساری انسانیت اور اس کی تمام فکری جدوجہد کی اچھی متاع کو اپنے اندر لے سکے۔

اسلام نے ابتدائی ایام میں تاریخ انسانی کی یہ خدمت بڑی خوبی سے سرانجام دی تھی، قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کس طرح مختلف قومیں اور تمدّن آپس میں گتھم گتھا ہورہے تھے اور ہر قوم اپنے آپ کو کافی بالذات اور مستغنی عن الغیر (دوسروں سے بے نیاز) سمجھتی تھی، عیسائی کہتے تھے کہ جو عیسائی نہیں وہ انسان ہی نہیں، اسی طرح یہودیوں نے اپنے آپ کو سب سے جدا کرلیا تھا، ایرانی اپنی جگہ مگن تھے، اور ہندوستان والوں نے سمندر پار دیکھنا تک خلاف مذہب بنا رکھا تھا۔ اس وقت دنیا کی یہ حالت تھی جیسے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں پانی رُک گیا ہو، اور ایک گڑھا دوسرے سے جُدا ہو، اور سب الگ الگ سڑ رہے ہوں، عربوں کی نئی قوم ایک سیلاب کی طرح نازل ہوئی اور انہوں نے سب گڑھوں کو ایک کردیا۔ اور ساری نوع انسانی الگ الگ گڑھوں کی بجائے ایک ذخّار سمندر بن گئی، سب قوموں کے ذہنی اور فکری دھارے اس میں گرنے لگے، اور اس طرح مجموعی طور پر انسانیت کو آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ عرب اَن پڑھ تھے، انہوں نے سب قوموں کے علوم کو سَر آنکھوں پر لگایا، ان کا کوئی بندھا ٹکا تمدّن نہ تھا۔

www.rahima.org

انہوں نے سب تمدُّنوں کو کھنگالا اور خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدِر (اچھی چیز لے لو بُری کو چھوڑ دو!) پر عمل کرتے ہوئے سب تمدُّنوں کے اچھے پہلو لئے۔ اسی طرح انہوں نے عیسائیت، یہودیت، مجوسیت اور صابیت سب کو ایک آنکھ سے دیکھا اور سب کو برملا طور پر کہہ دیا: "کہ انسان خواہ کوئی بھی ہو جو انسانیت کے بُنیادی اصولوں کو مان لے وہ اچھا انسان ہے، نام، نسل، رنگ اور گروہوں کے امتیازات سب باطل ہیں"۔ دوسرے معنوں میں عربوں نے انسانیت کو جو ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی، اس کا شیرازہ پھر از سرِ نو باندھ دیا اور الگ الگ اور باہم مخالف اور متخاصم (باہم جھگڑنے والی) قومیتوں کو ایک صحیح بین الاقوامی نظام دیا؛ یہی اسلام کا عالمگیر انقلاب تھا۔

مسلمانوں نے اسلام کے اس عالمگیر انقلاب پر بعد میں ایک عالمگیر تمدُّن انسانی کی بُنیاد رکھی۔ اِدھر بغداد میں اُدھر قرطبہ میں مشرق و مغرب کی تمام قوموں اور ان کے افکار و مذاہب کا اجتماع ہوا، ہر نسل کے لوگ آپس میں ملے، ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہوئے، ایک زبان کے علوم دوسری زبان میں ترجمہ ہوئے، ہندوستان کی طب و حکمت، یونان کے فلسفے، اسکندریہ کے علوم، ایرانیوں کا ادب، یہودیوں اور عیسائیوں کی روایاتِ مذہبی، اور عربوں کی زبان اور دین سے، انسانی تمدُّن کی ایک نئی ہیئت (شکل) کی ترکیب ہوئی، جو ماضی کے سارے علوم و فنون اور حکمت و فلسفے کا نچوڑ تھا۔ اور حال و استقبال کے لئے مشعلِ راہ۔ یہ تھا اسلام کا تاریخی کارنامہ، انسانیت مسلمانوں کے اس احسان کو کبھی نہیں بھولے گی۔

اسلام کے اس تاریخی کارنامے کی روح در اصل اس کی عالمگیریت اور جامعیت تھی مسلمانوں نے سب مذہبوں اور تمدُّنوں کو اصلاً ایک سمجھا۔ اُن کی مذہبی کتاب نے ساری انسانیت کو مخاطب کیا۔ اُن کے مفکروں نے علم و فلسفے پر بحث کی تو سب قوموں کے ذہنی سرمائے کو چھان ڈالا۔ اُن کے مؤرخ تاریخ لکھنے لگے تو انہوں نے حضرت آدمؑ سے شروع کر کے ساری قوموں کی تاریخ کو ایک زنجیر کی کڑیاں بنا کر پیش کیا۔

ہر قوم جو اپنے اپنے زمانہ تاریخ میں فکر و عمل کی دنیا میں بین الاقوامی قیادت کی مالک بنی اس کا طُرۂ امتیاز اس کی یہ عالمگیریت اور جامعیت تھی اور پھر جب اس قوم کے مٹنے کے

دن آئے تو اس قوم کے افراد کی نظریں تنگ ہوگئیں، ان کے دماغ اور بھی تنگ ہوگئے اور انسانیت کا بین الاقوامی تصور تو الگ رہا، ان کے ذہنوں میں اپنی پوری قوم کی سمائی (گنجائش) تک مشکل ہوگئی۔ وہ انسانیت سے قومیت پر آگئے اور قوم سے ان کے فرقے بن گئے۔ اور آخر فرقوں میں بھی آپس میں دال بٹنے لگی اور نفسی نفسی تک نوبت پہنچ گئی۔ پہلے یہودی اور عیسائی اس روگ (مرض) میں مبتلا ہوئے اور آج مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے۔

قومی ذہن کا انسانی تصور سے عاری ہونا، زوال کی طرف اس کا پہلا قدم ہوتا ہے۔

اسلام کے حق میں یہ دوام کا وعدہ محض اسی بناء پر تھا کہ وہ انسانیت عامہ کا تصور پیش کرتا ہے۔ فی الحقیقت مسلمان وہی ہے جس کے ذہن میں کُل انسانیت کی گنجائش ہے۔ ایک لحاظ سے اللہ پر ایمان لانے کے بھی یہی معنی ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی حکمت آفرین طبیعت کا یہ خاص کمال ہے کہ اس دور میں انہوں نے اسلام کی اس عالمگیر روح کو بے نقاب کیا اور اس سلسلے میں تمام مذاہب ادیان اور نظام ہائے اخلاق میں مشترک اُصول متعین فرمائے اور اس طرح از سرِ نو انہوں نے مسلمانوں کے سامنے وہ تمام ذہنی وسعتیں کھول دیں جو اسلام کے عہد اول میں دین کی روح سمجھی جاتی تھیں، لیکن بعد میں جب مُردہ دلی اور ذہنی پسماندگی کا دور دورہ ہوا تو مسلمان بھی گروہ بندی کا شکار ہوگئے اور وہ بین الاقوامی قیادت کے منصب سے محروم کر دیئے گئے۔

شاہ صاحبؒ نے جس طرح آئمہ فقہ کے چار مذاہب میں مُطابقت پیدا کی اور پھر حدیث وفقہ میں غلط فہمی سے بعض لوگوں کو جو تضاد نظر آتا تھا اس کو سلجھایا اور اس کے بعد یہ بھی بتایا کہ حدیث اور قرآن میں کوئی تعارُض نہیں، بلکہ حدیث در اصل قرآن ہی سے مستنبط ہے۔ نیز شریعت وطریقت میں جو نزاع چلا آرہا تھا اور اہل شریعت، طریقت والوں سے بیزار تھے اور اہل طریقت، شریعت والوں پر خفا۔ شاہ صاحبؒ نے طریقت کے افکار کو شریعت پر منطبق کیا اور بتایا کہ علم ومعرفت کی رقابت محض غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ اسلامی افکار ومذاہب کے مروجہ دائرے سے شاہ صاحبؒ کی نظر اور بلند ہوئی اور آپ کی بصیرت افروز نگاہ پر یہ حقیقت واشگاف ہوئی کہ حق شناس جہاں بھی ہوئے اور جس دور میں بھی ہوئے ان سب نے اس حقیقت کو ایک ہی رنگ میں دیکھا ہے۔ بے شک انہوں نے جن الفاظ

میں اس حقیقت کی تعبیر کی وہ زمانہ، ماحول اور مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جدا تھی ۔کم نگاہوں نے اس تعبیر کو اصل سمجھ لیا اور لگے آپس میں لڑنے ۔نتیجہ یہ ہوا کہ انسان آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ،یہی اصل ہے اختلاف عقائد کی، لوگوں نے ''حبل اللہ'' (اللہ کی رسّی) کو چھوڑ دیا اور اپنے تعصبات کو خُدا سمجھ بیٹھے۔

خُدا اور بندے کے تعلق کو ہی لے لیجئے۔کسی نے بندے اور خُدا کے تعلق کو بیٹے اور باپ سے تعبیر کیا اور کسی نے حُلول (سرایت کر جانے) سے ،الغرض ہر قوم نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق اس مافوق التعبیر تعلق کو عام فہم بنانے کی کوشش کی ،مقصود سب کا ایک ہی تھا لیکن تعبیریں جدا جدا ہو گئیں اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، ان تعبیروں کی وجہ سے اصل حقیقت پر پردے پڑنے لگے ۔آخر کو قرآن آیا تو اس نے اسی تعلق کو اس طرح پیش کیا کہ پہلے توہُمات اور گمراہیوں کا سدِباب بھی ہو جائے اور ہر ملت اور گروہ ،خالق اور مخلوق کے باہمی رشتے کو با آسانی سمجھ بھی لے ۔اس مسئلے میں قرآن کا اصل مقصد مذاہب کی تغلیط نہ تھی بلکہ دین کا ایک ایسا عالمگیر تصور پیش کرنا تھا جو سب کی سمجھ میں آجائے اور اس سے پہلے کی طرح غلط فہمیاں بھی پیدا نہ ہوں۔

شاہ صاحبؒ کے اس فکر کی بدولت ہی ہم نے سمجھا کہ قرآن جامع الامم ہے اور وہ صرف ایک گروہ یا قوم کی تاریخ کے بیان تک محدود نہیں ۔بے شک اس نے زیادہ تر بنی اسرائیل کے انبیاء کا ہی ذکر کیا ،لیکن یہ مصلحت اور ضرورت کا تقاضہ تھا۔ یقیناً فکر بھی انسانیت کی طرح غیر محدود ہوتا ہے لیکن اسے دوسروں کو سنانے کے لیے خاص الفاظ اور حروف میں قید کرنا پڑتا ہے تو مخاطبین کی رعایت سے اسے ایک خاص زمان اور مکان کے ساتھ مخصوص کرنا ہوتا ہے ۔قرآن کے پیرایۂ بیان کی خُصوصیت بھی اسی بُنیاد پر ہے ۔لیکن اسکے باوجود جا بجا بین السطور مفہوم کی عالمگیریت اور جامعیت بھی اسی بُنیاد پر ہے ۔اور اگر آدمی قرآن کے مطالعے میں تدبر و تعمق (گہری نظر) سے کام لے تو اس پر واضح ہو جائے گا کہ کُل نوع انسانی قرآن میں اپنا مافی الضمیر اور مقصد پا سکتی ہے۔

ہمارے نزدیک شاہ ولی اللہ حکیم وصدیق ہیں ۔جنہوں نے سارے ادیان، مذاہب اور شریعتوں کا اصلاً ایک ہونا ثابت کیا اور پھر ان بُنیادی اصولوں کا تعین بھی کیا جو ہر دین کا

www.rahimia.org

مقصود حقیقی تھے اور ہر مذہب اور شریعت ان کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتی رہی۔ شاہ صاحبؒ ''ہمعات'' میں لکھتے ہیں: ''اس فقیر پر یہ بات روشن کی گئی ہے کہ تہذیبِ نفس کے سلسلے میں جو چیز شریعت میں مطلوب ہے وہ چار خصلتیں ہیں، حق تعالیٰ نے انبیاءؑ کو انہی چار خصلتوں کے لئے بھیجا، تمام ملل حقہ میں انہی چار خصلتوں کا اِرشاد اور ان کے حاصل کرنے کی ترغیب وتحریص ہے، ''بر'' یعنی بھلائی: انہی چار خصلتوں کا حاصل ہے۔ اور ''گناہ'' سے مراد: وہ عقائد واعمال اور اخلاق ہیں جو انہی چار خصلتوں کی ضد ہیں۔

(1) ان چار خصلتوں میں ایک ''طہارت'' ہے۔ اسکی حقیقت اور اس کی طرف میلان ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ یہ گمان نہ کر لینا کہ یہاں طہارت سے مراد محض وضو اور غسل ہے بلکہ طہارت کا اصل مقصود وضو اور غسل کی روح اور ان کا نور ہے۔ جب آدمی نجاستوں میں آلودہ ہو اور میل کچیل اور بال اس بدن پر جمع ہوں۔ بول وبراز اور ریح نے اس کے معدے میں گرانی پیدا کی ہو تو ضروری اور لازمی بات ہے کہ وہ انقباض، تنگی اور حزن اپنے اندر پائے گا اور جب وہ غسل کرے گا اور زائد بالوں کو دُور کرے گا۔ اور صاف لباس زیب تن کرے گا اور خُوشبو لگائے گا تو اسے اپنے نفس میں انشراح، سُرور اور انبساط کا احساس ہوگا، حاصل کلام یہ ہے کہ طہارت یہی وِجدانی کیفیت ہے جو اُنس اور نور سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔

(2) دوسری خصلت اخبات: (خُدا تعالیٰ کے لیے خُضوع) یعنی نہایت درجے کی عجز ونیاز مندی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک سلیم الفطرت شخص جب طبعی اور خارجی تشویشوں سے فراغت کے بعد صفاتِ الٰہی اِس کے جلال اور اسکی کبریائی میں غور کرتا ہے تو اس پر ایک حیرت اور دہشت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، یہی حیرت اور دہشت خشوع وخُضوع یعنی نیاز مندی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک سوچنے والا انسان جب کائنات کی اس گتھی کو حل کرنے سے عاجز آجاتا ہے اور اس عجز اور افتادگی کی حالت میں وہ کسی اور قوت کے سامنے اپنے آپ کو بے دست وپا پاتا ہے تو اس کی یہ بے دست وپائی اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے سے بلند تر کسی اور قوت کو مانے۔ ایک سائنس دان نے اسے ''مادے'' سے تعبیر کیا، فلسفی نے اسے ''عقل کُل'' مانا اور مذہبی اسے

www.rahmania.org

"خُدا" کہتا ہے، بہر حال انسان کہیں نہ کہیں اس کائنات کے سامنے اپنے آپ کو ضرور مجبور پاتا ہے اور یہی مجبوری اسے خُضُوع کی طرف لے جاتی ہے۔

(3) تیسری خصلت "سماحت" (فیاضی) ہے اس کے معنی یہ ہیں: "کہ نفس طلب لذت، حُبِّ انتقام، بُخل اور حرص وغیرہ سے مغلوب نہ ہو"، اس کے ذیل میں عِفّت، جدو جہد، صبر وعفو، سخاوت قناعت اور تقویٰ تمام آجاتے ہیں:

(۱) شکم (پیٹ) اور فرج (شرمگاہ) کی خواہش کو قبول نہ کرنے کا نام "عِفّت" ہے۔
(۲) آسائش اور ترک عمل کی خواہش کو قبول نہ کرنے کا نام "جدو جہد" ہے۔
(۳) مصیبت، پریشانی اور دباؤ کے موقع پر جزَع فزَع (رونے پیٹنے) سے رُکنا "صبر" ہے۔
(۴) کسی سے بدلہ اور انتقام کی خواہش کو دبانا "عفو" ہے۔
(۵) خواہشِ بخل کو چھوڑ دینے کا نام "سخاوت" ہے
(۶) حرص اور لالچ کو قبول نہ کرنا "قناعت" ہے۔
(۷) شریعت کی بنائی ہوئی حدوں سے تجاوز نہ کرنا اور عدل قائم کرنا "تقویٰ" ہے۔

(4) چوتھی خصلت "عدالت" ہے۔ سیاسی اور اجتماعی نظاموں کی روح رواں یہی خصلت ہے، ادب، کفایت، حُرِیت، سیاستِ مدینہ اور حُسنِ معاشرت وغیرہ سب عدالت کی شاخیں ہیں:

(۱) اپنی حرکات وسکنات پر نگاہ رکھنا، عُمدہ اور بہتر وضع قطع اختیار کرنا اور دل کو ہمیشہ اس طرف متوجہ رکھنا "ادب" ہے۔
(۲) جمع اور خرچ، خرید وفروخت اور تمام معاشی معاملات میں عقل وتدبُّر سے کام لینا "کفایت" ہے۔
(۳) خاندانی امور کو بغیر کسی دباؤ کے پوری ذمہ داری کے ساتھ سرانجام دینا "حُرِیت" ہے۔
(۴) ملکوں اور قوموں کا نظام درست رکھنا اور لشکروں کا اچھا انتظام کرنا "سیاستِ مدنیہ" ہے۔

www.rahimia.org

(۵) باہمی بھائی چارہ اختیار کرنا اور ہر ایک کے حق کو پہچاننا اور ان سے اُلفت و بشاشت سے پیش آنا ''حُسنِ معاشرت'' ہے۔(1)

یہی چار اخلاق ہیں جن کی تکمیل سے انسانیت کو ترقی ملتی ہے اور ان کے چھوٹنے سے انسان قعرِ مذلت (ذلت کے گڑھے) میں گرتا ہے۔اس دنیا میں جتنے بھی تمدُّن بنے اور جس قدر بھی فکری ادارے قائم ہوئے اور جو بھی شریعتیں معرضِ وُجود میں آئیں، اگر ان کے پیشِ نظر انسانوں کو اُٹھانا اور ان کی حالت کو درست کرنا تھا تو انہوں نے انہی چار اخلاق کو سنوارنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں اسلام، عیسایت اور یہودیت کا معاملہ تو بالکل ظاہر ہے لیکن اگر چینی فلسفۂ اخلاق، ہندوؤں کے مذہبی فکر، ایرانیوں کے نظامِ حیات، یونانیوں کی حکمت اور قدیم مصریوں کے مذہب کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کو کسی نہ کسی صورت میں ان چار اخلاق کی درستی اور ان کی ضدوں سے بچنے کی تاکید ملے گی۔ ایرانی حکیم بزرجمر کے اقوال، افلاطون کا اپنی کتاب ''ریاست'' میں عدالت کو زندگی کی بُنیاد ثابت کرنا، قدیم مصریوں کا مذہبی صحیفہ ''کتاب الموتی'' کے ارشادات، ہندوؤں کے ویدوں اور گیتا کا پرحکمت کلام اور چینیوں کے اخلاقی فلسفے ''کنفوشس'' کی تعلیمات ان سب کا حاصل کم وبیش یہی تھا کہ انسانیت کے ان چار بنیادی اخلاق کو ترقی دی جائے اور تمام رسول اسی لئے مبعوث ہوئے اور تمام حق شناس حکیم اور صدیق اپنی اپنی قوموں کو یہی پیغام سناتے رہے۔

لہٰذا اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ جائیں تو پھر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے نظریۂ اخلاق میں اصولی نزاع نہ رہے گا اور ہم میں فراخدلی اور رواداری بھی پیدا ہو جائے گی۔ بے شک سماج کے چھوٹے طبقوں میں تو چپقلش موجود رہے گی، لیکن ایسے ہی جیسا کہ ایک ہی ملت کے مختلف فرقوں میں مخصوص رجحانات اور استعدادوں کی بناء پر ذہنی اور مذہبی اختلافات ہوتے ہیں، لیکن جہاں تک اصحاب عقل ورُشد کا تعلق ہے ان کو آفتابِ نبوت سے پھوٹی ہوئی شعاؤں اور حکیم کے دماغ سے نکلے ہوئے اخلاقی نظام میں فرق مراتب تو ضرور نظر آئے گا لیکن وہ دونوں کو ایک دوسرے کی ضد نہ سمجھیں گے۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صالح غیر مسلم اور صالح مسلمان ایک دوسرے کی خوبیوں کو بحیثیت انسان کے نظرِ انصاف سے

جانچنے کے قابل ہوں گے۔

ہمارے خیال میں یہ تصور کل بنی نوع انسان کو موجودہ خلفشار سے نکال سکتا ہے۔ ہر قوم کے عقل مند طبقوں کا رُجحان اب اس طرف ہو رہا ہے اور وہ کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے اپنے فکری نظاموں کو عالمگیر انسانیت کا ترجمان بنا کر پیش کریں، لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ دین جو صحیح معنوں میں ساری دنیا کا دین تھا اور وہ کتاب جو کل نوع انسانی کی ہدایت کی علمبردار تھی اور وہ ملت جس نے سب قوموں کی ایک بنایا اور جس کا تمدّن ساری انسانیت کی ''باقیات صالحات'' کا مرقع تھا۔ وہ دین، وہ کتاب، وہ ملت اور اس کا تمدّن ایک فرقے کی جاگیر بن کر رہ گیا ہے اور وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ اس وسعت پذیر دور میں جس میں کہ کرۂ زمین کی سب دوریاں سکڑ گئی ہیں ملکوں، قوموں اور براعظموں کی سرحدیں سمٹتی جارہی ہیں، ریل، جہاز طیاروں اور ریڈیو نے سب انسانوں کو اپنی کہنے اور دوسروں کی سننے کے لئے ایک انسانی برادری میں بدل دیا ہے۔ اس زمانے میں ایسی تعلیم کو جو صحیح معنوں میں عالمگیر اور انسانی تھی ایک گروہ اور جماعت میں محدود کر دینا کتنا بڑا ظلم ہے۔ معلوم نہیں مسلمان اسلام کو کب سمجھیں گے؟ اور قرآن کے پیغام کو کب اپنائیں گے؟

حوالہ جات:

(1) دیکھئے جمعات (فارسی): جمعہ نمبر ۱۷، ص ۸۹ مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد (اردو ترجمہ ص ۱۵۰) مطبوعہ سندھ ساگر اکیڈمی لاہور۔

مقالہ نمبر (۲)

﴿خُدا پرستی، انسان دوستی﴾

میرے نزدیک ساری آسمانی کتابیں در اصل وحدت انسانیت کی ترجمان ہیں اور حقیقت شناس حکیم بھی اسی فکر کے مفسر تھے، لیکن ہوا یہ کہ ان کے متبعین نے اپنی الگ الگ ٹولیاں بنالیں اور اپنی ٹولی کو اور اپنی ٹولی کی بات کو وہ ساری انسانیت کا مدعا بنا بیٹھے۔ ہر قوم کا دعویٰ ہے کہ ہمارا نبی آخری ہے اور ہمارا دین سب سے سچا دین ہے۔ ہر قوم اس کے ثبوت میں دلیلیں دیتی ہے، بُرہان و منطق کے زور سے اپنی بات منوانے پر اصرار کرتی ہے۔ دوسروں کی کتابوں میں مین میخ (نقص) نکالتی ہیں۔ اور ان کی کتابوں پر اعتراضات ہوں تو ان کی صفائی پیش کرتی ہے، کیا ایک حقیقت کا جویا (متلاشی) اس صورت حال سے پریشان نہیں ہو جاتا؟ آخر یہ کیسے پتہ چلے کہ اصل ہدایت کہاں ہے؟ اور حق کیا ہے؟

ان الجھنوں سے نکلنے کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ مذاہب اور آراء کے ان اختلافات کو ایک طرف رکھو اور عام انسانیت کی تاریخ کا مطالعہ کرو اور پھر پتہ لگاؤ کہ آخر مجموعی انسانیت کا طبعی تقاضہ کیا ہے۔ انسان کن باتوں سے قعر تنزل (پستی کے گڑھے) میں گرے اور کونسے اُصول تھے جن پر چل کر وہ بام رفعت (بلندی) پر پہنچے۔ اس تلاش و جستجو کے بعد انسانوں کی اس طویل تاریخ میں جو اُصول سب قوموں کے درمیان مشترک نظر آئیں گے وہ "فطرۃ اللہ" ہے۔ اور یہی "دین قیم" ہے اور جو تعلیم مجموعی انسانیت کی اس فطرت کے مطابق ہوگی وہی حق ہے۔

قرآن مجید کے برحق ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ ایسی تعلیم دیتا ہے جو سب انسانوں کے فطری رجحانات کی آئینہ دار اور ساری نوع انسانی کے فائدے کے لئے ہے۔ لیکن اگر قرآن کو ایک فرقہ یا گروہ کی کتاب بنادیا جائے تو پھر یہ ثابت کرنا کہ وہ ازلی اور ابدی ہے اور اس کی تعلیمات سب کے لئے ہیں اور ہر زمانے کے لئے ہیں، بڑا مشکل ہے، قرآن کی عالمگیریت محض اس بناء پر ہے کہ وہ کل انسانیت کی کتاب ہے۔

www.rahmia.org

میرا یہ عقیدہ ہے کہ انسانیت کی ترقی کے لئے ہر دور میں اچھے لوگ آتے رہے، ان حق شناس بندوں نے انسانوں کی ہدایت کے لئے اپنے اپنے وقت میں تعلیماتِ الٰہی کی تبلیغ کی اور اس طرح انسانیت کا قافلہ منزل بہ منزل آگے بڑھتا چلا گیا، عہد ماضی کے یہ روشن نقوش انسانی تاریخ کے صفحات پر کم وبیش کچھ ردو بدل کے ساتھ ثبت ہیں، قرآن کے عالم کو چاہئے کہ وہ انسانی تاریخ کے اس مطالعے سے معلوم کرے کہ انسانی ترقی کے عام اور غیر متبدل قوانین کونسے ہیں، اس کے بعد وہ قرآن میں غور کرے، وہ دیکھے گا کہ قرآن ان ہی عالمگیر اور نا قابل تغیر اصولِ حیات پیش کرتا ہے۔ یہ قرآن کا صحیح مفہوم ہے اور یہی چیز ہے جو ازل سے ابد تک قائم رہے گی، اور اسی کے ماننے میں تمام انسانوں کا بھلا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، تمام انسانوں میں ایک وحدت فکری ہے اور ان میں یہی ایک نقطہ اشتراک ہے جس سے ادیان، اجناس اور اقوام کے اختلاف گم ہو سکتے ہیں، نیز قرآن اور دوسری الٰہی کتابیں اسی وحدتِ فکری کی ترجمان ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مذہب نے اپنی ایک ملت (جماعتی تنظیم) بنائی اور اس ملت کو اپنے لئے شریعت یعنی قانون بنانے کی ضرورت پڑی، ایک ملت نے ایک وضع اختیار کی اور دوسری ملت نے دوسری وضع، ایک کی شریعت کچھ اور تھی اور دوسری کی کچھ اور۔ اب اگر ہم ان تمام ادیان کی وحدت مان بھی لیں تو شریعتوں کے اِن اختلافات کا کیا جواب ہے؟

بات یہ ہے کہ قانون نتیجہ ہوتا ہے کہ ایک خاص قوم کے خاص حالات اور خاص زمانے کے تقاضوں کا، زمانہ بدلتا ہے اس کے ساتھ اس کے تقاضے بھی بدلتے ہیں، اور حالات میں بھی تبدیلی ہوتی ہے۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (۵۵:۲۹) یعنی ہر نیا زمانہ "شان اللہ" ہے اور اللہ کے "شئون" کی نہ کوئی حد ہے اور نہ حساب، نئے زمانے کو نہ ماننا اور اس کے تقاضوں کا انکار کرنا "شئون اللہ" کا انکار ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کی تعلیم کا صحیح تجزیہ کیا، حکمت جو دائمی، سرمدی اور عالمگیر ہے، اس کو قانون سے نمایاں کرے دکھایا۔ چونکہ قانون کا قوم کے مزاج اور حالات سے متاثر ہونا ضروری ہوتا ہے اس لئے قانون ابدی اور سرمدی نہیں ہوسکتا، ابدیت صرف حکمت کو ہے اور قانون کی

www.rahimia.org

حیثیت ایک نمونے اور مثال کی ہوتی ہے۔الغرض قرآن نے جو حکمت پیش کی ہے وہ ابدی ہے۔

اب اگر قرآن کو یوں سمجھا جائے تو آدمی ہر عامی وفاضل (عام وخاص) کو قرآن کا مفہوم ذہن نشین کرا سکتا ہے اپنے مذہب والے کو بھی سمجھا سکتا ہے اور غیر مذہب والے اور لامذہب کو بھی قائل کر سکتا ہے، میرے خیال میں ہر وہ شخص جو سوچتا ہے اور سوچ سمجھ کر دنیا میں چلنے کا خیال رکھتا ہے وہ کسی مذہب کا ہو، یا اس کا کوئی مذہب نہ ہو وہ قرآن کے اس مفہوم کو ضرور مانے گا۔

مقصد یہ ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ لازماً زندگی کے مظاہر بدلتے جاتے ہیں، لیکن مظاہر کی تبدیلی کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اب زندگی کی اصلیت میں بھی کوئی فرق آ گیا ہے، بیشک قرآن کی تعلیم کا نتیجہ ایک زمانے میں ایک خاص مظہر میں جلوہ گر ہوا۔اب ضروری نہیں کہ وہ دوسرے زمانے میں پھر بعینہٖ اسی صُورت میں ظاہر ہو، صحابہؓ کے زمانے میں تیر وکمان تلوار اور ڈھال سے جہاد ہوتا تھا۔اور مجاہدین اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر جہاد کو نکلتے تھے، اب قرآنی تعلیم نے اگر کبھی اپنے پیروکاروں کو جہاد پر آمادہ کیا تو ضروری نہیں کہ پھر تلوار، ڈھال، اونٹ اور گھوڑوں کی نوبت آئے۔اسی طرح خلافت راشدہؓ کے دور میں مساوات اور انصاف کا اُصول ایک خاص نہج پر نافذ ہوا، اب زندگی بہت بدل گئی ہے اور اس کے ساتھ زندگی کی ضرورتیں بھی بدل گئی ہیں، اس لئے مساوات اور انصاف کا حلقہ اثر بھی وسیع ہوگا، یعنی مقاصد تو وہی رہیں گے، لیکن ان کی عملی شکل حالات واسباب کی تبدیلی کی وجہ سے پہلی سی نہ ہوگی، اصل مقصد کا تعلق حکمت سے ہے اور عملی شکل کا نام قانون ہے۔

مختصراً قرآن کا مقصود اصلی انسانیت عامہ کا تزکیہ اور اس کا ارتقاء ہے، وہ تمام انسانیت کو اس بُنیادی اُصول ومقصد کی طرف لوٹانے آیا تھا، اس کا پیغام یہ تھا کہ سب انسان ایک ہیں، رنگ ونسل اور قوم کا فرق حقیقی نہیں، دھڑے بندیاں اور گروہ بنانے کی طبقہ وارانہ ذہنیت غلط ہے، قرآن نے زندگی کے یہی عالمگیر اور ناقابل تغیر اُصول پیش کئے ہیں۔ان کو اگر غور سے سمجھ لیا جائے تو ذہن وحدت انسانیت کی صحیح روح کو پا لیتا ہے۔

اسی بناء پر قرآن نے اپنے ابتدائی عہد میں قیصریت اور کسرویت کو جو اس وقت استحصال بالجبر کی بدترین مظہر تھیں، ختم کرنے کی دعوت دی، اور اس کی جگہ ایسا نظام قائم کیا جس میں انسانی مساوات، ہر ایک سے انصاف اور اخوّت، بُنیادی اُصول تھے، قرآن کی تمام تعلیمات کا دار و مدار ہمارے خیال میں انہی اعمالِ صالحات پر ہے اور چونکہ جب تک اعلیٰ اور بلند نصب العین انسان کے سامنے متعین نہ ہو اس سے اعمالِ صالحات کا ظہور ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن نے بار بار ایمان باللہ پر زور دیا ہے یعنی ایمان باللہ نصب العین ہے اور مساوات، انصاف اور اخوت کے ذریعے انسانیت عامہ کی فلاح و بہبود اس نصب العین کو عمل میں لانے کا ذریعہ اور طریق ہے۔

اگر نظرِ بصیرت سے دیکھا جائے تو ایمان باللہ کا عقیدہ انسانیت کے لئے ایک بلند اور اعلیٰ نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے اور اس دنیا میں اس سے ارفع تصور ممکن نہیں۔ اللہ کے تصور میں وحدتِ انسانیت اور وحدتِ کائنات سب آجاتے ہیں اور ذہن کے سامنے لامحدود آفاق اور بے کنار وسعتیں واشگاف ہو جاتی ہیں۔ اللہ کا صحیح تصور سب پنہائیوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے اور فکرِ انسانی کی کوئی بلندی اور وسعت نہیں جو اس تصور سے بلند تر اور وسیع تر سوچی جا سکے۔ ایمان باللہ کی سب سے اونچی منزل یہ ہے کہ آدمی یہ مانے کہ اس زمین اور آسمان میں اگر کوئی وُجودِ حقیقی ہے تو اسی کا ہے، جو کچھ ہے سب اسی کا فیضان ہے، اور جو کچھ ہوتا ہے اس کا اصلی سبب وہی ہے۔

ایمان باللہ یا خُدا پرستی کی ایک منزل انسان دوستی ہے، اگر آدمی یہ مانتا ہے کہ سارے انسان اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اور اس کو خالق حقیقی سے محبت ہے، تو لازمی ہے کہ اس کی مخلوق سے بھی محبت ہو، اور اگر اسے مخلوق سے محبت نہیں، تو یہ سمجھ لو کہ وہ خُدا کی محبت کے دعویٰ میں سچا نہیں، خُدا پرستی کی پہچان اس دنیا میں تو یہی ہے کہ خُدا پرست انسان کو خُدا کے سارے بندوں سے محبت ہو، اور وہ خُدا کی خوشنودی، اس کی مخلوقات کی خدمت اور اس کی بہبودی میں ڈھونڈے۔

ہمارے صوفیاء کرام نے تو خُدا پرستی کی اس عملی شکل یعنی انسان دوستی کو اصل دین قرار دیا تھا، ان کا تو یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ جسے صرف اپنے گروہ اور جماعت سے محبت ہے اور وہ

دوسروں کو جو اس کے ہم عقیدہ نہیں، نفرت سے دیکھتا ہے وہ سچا موحد اور خُدا پرست نہیں ہوسکتا وہ اپنی تعلیمات میں ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ تمام انسانوں کو "عَیَــالُ اللّٰہِ" (اللہ کا کنبہ) سمجھو! اوران کا خود اپنا عمل بھی اس کا شاہد تھا، لیکن اس سے یہ خیال نہ ہو کہ انہوں نے صواب و نا صواب اور ثواب و گناہ کی تمیز اٹھا دی تھی۔ بے شک وہ نیکو کار کو اچھا سمجھتے تھے، لیکن غلط کار کا انہیں اس نیکوکار سے زیادہ خیال رہتا تھا، اور جس طرح ماں اپنے نافرمان بچے کے لئے زیادہ کڑھتی ہے اور اس کا اُسے دوسروں سے زیادہ خیال ہوتا ہے، اسی طرح غلط کار کو سیدھے راستے پر لگانے کے لئے یہ خُدا پرست بزرگ بے قرار رہتے تھے۔

انسان دوستی خُدا پرستی یا ایمان باللہ کا یہی جذبہ تھا، جس نے رسول اکرم ﷺ کو گھر کا آرام قربان کرکے مکّے والوں کوراہ راست پر لانے کے لئے بے تاب کردیا تھا۔ گو آپ کو ہر نعمت میسر اور ہر قسم کا اطمینان حاصل تھا، لیکن دوسروں کا دُکھ اور ان کی گمراہی تھی کہ آپ ﷺ کو بے چین کئے دیتی تھی، چنانچہ وہ مکے میں اپنا پیغام سناتے پھرتے تھے، طائف والوں کو جا کر حق کی دعوت دیتے تھے، سختیاں ہوتیں تو صبر کرتے اور جو سختیاں کرتے ان کے لئے بد دعا نہیں بلکہ دعا کرتے، درحقیقت تورات، انجیل اور قرآن سب اسی انسان دوستی کے مسلک کی ترجمان ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور رسول اکرم ﷺ کی تعلیم اور عمل، خُدا پرستی کی اسی مادی شکل یعنی انسان دوستی کا نمونہ تھا، بعد والوں نے ان کی انسان دوستی کو اپنے اپنے گروہوں کی دوستی تک محدود کرلیا، اور خُدا پرستی جس سے مقصود یہ تھا کہ انسان کے دل میں مجموعی انسانیت کے لئے وسعت پیدا ہوجائے، اتنی مسخ ہوئی کہ مدعی کے دل میں اپنی ذات کے سوا کسی اَور کی سَمائی (گنجائش) مشکل ہوگئی۔

صوفیاء کرام کی کتابوں اور ارشادات میں بار بار اسی انسان دوستی پر زور دیا گیا ہے۔ اور طرح طرح کی مثالوں سے یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اُس وقت تک آدمی خُدا پرست نہیں ہوسکتا جب تک سارے انسانوں سے اسے محبت نہ ہو، شیخ سعدیؒ نے (اپنی کتاب) "بوستان" میں اس بات کو واضح کرنے کے لئے ایک حکایت لکھی ہے،

فرماتے ہیں:

''حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عادت تھی کہ جب تک کوئی مہمان دستر خوان پر موجود نہ ہوتا، کھانا نہ کھاتے، ایک دفعہ کوئی مہمان نہ آیا، دوپہر کو آپ گھر سے نکل کر مہمان کا انتظار کررہے تھے، سخت گرمی کا موسم تھا، لو چل رہی تھی اور تپش کے مارے ہر ذی روح کا برا حال تھا، دیکھتے کیا ہیں کہ دور سے ایک بوڑھا گرتا پڑتا چلا آرہا ہے اس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں، اس کا جسم گرد وغبار سے اَٹا پڑا ہے، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑے شوق سے مہمان کا استقبال کیا اور خوشی خوشی اسے مکان کے اندر لے گئے، دستر خوان چُنا گیا اور آپؑ نے بسم اللہ کہہ کر لقمہ توڑا، مہمان نے اللہ کا نام لئے بغیر کھانا شروع کردیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تعجب ہوا، پوچھنے پر اس نے کہا کہ میں تو اللہ کو مانتا نہیں ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ کا اتنا سننا تھا کہ غصہ سے بے تاب ہوگئے اور اسے اسی حال میں بغیر کھائے پیے گھر سے باہر نکال دیا، اس کے بعد فوراً ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا گیا کہ میں نے تو اپنے اِس بندے کو سو۱۰۰ سال تک کھانا پینا دیا، اور اس کی ہر ضرورت کو پورا کیا، لیکن تم سے یہ بھی نہ ہوسکا کہ میرے بندے کو ایک وقت کا کھانا ہی کھلا سکتے''۔(1)

اسی مضمون کی رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث مروی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک بندے سے پوچھے گا کہ میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہ کھلایا؟ بندہ حیران ہوکر کہے گا کہ اے باری تعالیٰ! تو تو بھوک سے بے نیاز ہے، تجھے کھانے کی کیا حاجت، پھر ارشاد ہوگا کہ میں پیاسا تھا تو نے مجھے پانی نہ پلایا؟ پھر کہے گا کہ میں ننگا تھا، تو نے مجھے کپڑا نہ پہنایا؟ ہر سوال کے جواب میں بندہ کہے گا کہ اے میرے رب! تجھے ان چیزوں کی کیا ضرورت، تُو تو ان سب چیزوں سے بے نیاز ہے، اس وقت خُدا تعالیٰ فرمائے گا کہ میرا ایک بندہ بھوکا تھا تو نے اسے کھانا نہ کھلایا۔ وہ پیاسا تھا تو نے اسے پانی نہ پلایا، وہ ننگا تھا تو نے اسے لباس نہ پہنایا''۔(2)

تو کہنا یہ ہے کہ صحیح خدا پرستی آگے چل کر لازماً انسان دوستی کا موجب ہوتی ہے، قرآن مجید اسی خُدا پرستی کی تعلیم دیتا ہے اور میں نے قرآن مجید سے یہی سیکھا ہے کہ سب انسانوں کو ایک سمجھو اور جس بات کو تم جانتے ہو کہ اس میں سب کا بھلا ہے، وہ بات ہر ایک سے کہو! سمجھاؤ! بار بار اس کے ذہن نشین کراؤ! اور اگر یہ بات اس کے دل میں راہ نہیں پیدا

کرتی اور بیچ میں کچھ رکاوٹیں ہیں، تو نرمی سے ان رکاوٹوں کو دور کرو! اور اگر نرمی سے کام نہیں چلتا تو تم حکمت کے ساتھ طاقت استعمال کرو! یہ طاقت ان آدمیوں کے خلاف ہوگی جو برائی کے مرتکب ہیں اور نہ اس کا محرک ان سے نفرت کا جذبہ ہوگا، بلکہ دراصل ان رُکاوٹوں کے خلاف ہوگی جو انسانوں کو انسانیت سے دُور رکھنے کا سبب ہیں، کلمۂ حق یہی ہے اور حق کے لئے جہاد کرنے کے یہی معنیٰ ہیں، جہاد بے شک بَدوں (بُرے لوگوں) کے خلاف ہوتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس سے مقصود بَدی کا استیصال (خاتمہ) ہے اور بدی سے جنگ کرنا انسانوں کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

حوالہ جات:

(1) بوستان از شیخ سعدیؒ باب دوم "در احسان" حکایت در اخلاق پیغمبراں (ص ۷۰) مطبوعہ مکتبہ شرکت علمیہ ملتان۔

(2) مسلم شریف، باب فضل عیادۃ المریض، مطبوعہ نور محمد کراچی۔

www.rahmia.org

مقالہ نمبر (۳)

﴿وحدتِ انسانیت﴾

زندگی کا مَا حَصَل (خلاصہ) یہ ہے کہ آدمی ایک عقیدہ رکھے اور اس کو عملی دنیا میں مادی شکل دینے کے لئے مُسلسل جہاد کرتا رہے، انسان اپنے آپ سے جہاد کرے، خاندان سے جہاد کرے، اپنے سماج سے جہاد کرے، رسم ورواج کے خلاف جہاد کرے، قوم اُس کے عقیدے کی راہ میں حائل ہوتی ہے تو اس سے جہاد کرے، اور اگر وہ دیکھتا ہے کہ ساری دنیا اس کے عقیدے کی رُو سے غلط کار ہے تو وہ اس کے خلاف بھی جہاد کرے، اگر عقیدہ محض عقیدہ رہتا ہے، اور خارج میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو یوں سمجھنا چاہئے کہ عقیدہ ناپختہ ہے، اسی طرح اگر کوئی عقیدہ رکھے بغیر جہاد کرتا ہے تو اس کا یہ جہاد بھی ناقص ہے اور اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

میں نے زندگی میں عقیدہ اور عقیدے کو عملی شکل دینے کے لئے جہاد کرنے کا یہ سبق قرآن مجید سے سیکھا اور اس سبق کا عملی نمونہ مجھے رسول مقبول ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کی زندگیوں میں بدرجہ اتم نظر آیا، میں مسلمان ہوا تو شاہ اسماعیل شہیدؒ سے مجھے خاص طور پر موانست (اُنس و محبت) ہوگئی اور ان کی مجاہدانہ زندگی میرے لئے کشش کا باعث بنی، ان بزرگوں کے عمل نے میرے جذبۂ جہاد کو گرمایا، اور ان کی تعلیمات نے میرے عقیدے کو وسعت اور گہرائی بخشی، وہ جذبہ جو بچپن میں صرف پنجاب اور سکھوں تک محدود تھا، شاہ ولی اللہؒ اور ان کی جماعت کی برکت سے اتنا وسیع ہوا کہ وہ ساری دنیا پر محیط ہو گیا، ان مرشدوں ہی نے مجھے بتایا کہ قرآن صرف مسلمانوں کی کتاب نہیں بلکہ کل انسانیت کا صحیفہ ہے اور مجھے اس کا مطالعہ کرتے پچاس ساٹھ برس ہونے کو ہیں، لیکن مجھے ان بزرگوں کی بات پر کبھی شبہ نہیں ہوا، اس کو سو فیصد درست پایا۔

قرآن مجید کل انسانیت کی راہ نمائی کے بُنیادی فکر کا ترجمان ہے، یہ بُنیادی فکر نہ کبھی

www.rahimia.org

بدلا ہے اور نہ آئندہ کبھی بدلے گا، سارے ادیان، مذاہب اور فلسفوں کا اصل الاصول یہی فکر ہے، اس بُنیادی فکر کو" فطرت اللہ" کہہ لیجئے، اسے "دین" کا نام دیجئے یا اسے ضمیر انسانی سے تعبیر کیجئے، اسی ضمیر انسانی کی ترجمانی انبیاء، صلحاء اور حکماء کرتے آئے ہیں، زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اصلی فکر میں باہر سے کدورتیں شامل ہوتی گئیں اور بار بار نئے "نذیر" اور "بشیر" کی ضرورت پڑی، قرآن مجید بھی اسی بُنیادی فکر کا ترجمان ہے، اور یہ بُنیادی فکر عالم گیر، ازلی ابدی اور لازوال، ہے قرآن میں بے شک اس فکر کا جامہ عربی ہے اور "اُمّ القریٰ" اور "مَن حولھا" (مکہ مکرمہ اور اردگرد کے علاقے) کو سمجھانے کے لئے زبان اور پیرایۂ بیان میں ماحول کے لوازم کا خیال رکھا گیا ہے، لیکن "مشاہدۂ حق" کے بیان کے لئے ہمیشہ "ساغر و مینا" کی ضرورت پڑتی رہی ہے، اہل نظر جانتے ہیں کہ کہنے والے نے کیا کہا ہے اور ان کو اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ الفاظ و تراکیب کی سرحد سے بہت پَرے معانی کا مقصودِ اصلی کیا ہے۔

قرآن مجید اسی ضمیرِ انسانی کا ترجمان ہے ہے، گیتا نے بھی اپنے زمانے میں اسی حقیقت کی ترجمانی کی تھی، تورات اور انجیل بھی اسی ضمیر انسانی کے شارح رہے ہیں اور دیگر حکماء نے بھی کہیں کم، کہیں زیادہ، اسی راز سے پردہ اٹھایا ہے؛ توراۃ اور انجیل حق ہیں لیکن جو غلط معانی انکے الفاظ کو پہنائے گئے ہیں وہ باطل ہیں، اسی طرح قرآن حق ہے لیکن جس طرح مسلمان اس کو عام طور پر مانتے ہیں اور جو تفسیر وہ کرتے ہیں وہ حق نہیں، اگر تورات اور انجیل کو غلط ماننے والے کافر قرار دیئے جاسکتے ہیں، تو قرآن کو غلط مفہوم میں ماننے کیسے سچے مؤمن کہے جائیں گے۔

تعلیماتِ شاہ ولی اللہؒ کے آئینے میں ہم نے قرآن کو اس کی اصلی شکل میں دیکھا اور ہمیں معلوم ہوا کہ خالص اور بے میل انسانیت ہی قرآن کا صحیح اور مکمل نصب العین ہے، جو تعلیم عام انسانیت کی ترقی کے لئے معاون ہے وہ حق ہے اور جو تعلیم انسانیت کے ارتقاء میں حارج ہو وہ حق نہیں ہوسکتی، ان معنوں میں قرآن مجید میرا عقیدہ بنا اور قرآن کو عملی شکل دینے کے لئے جدوجہد کرنا زندگی کا مقصد ٹھہرا، قرآن کے اصولوں پر اس دنیا میں خالص انسانیت کا قیام ہمارا عقیدہ ہے، ہمارے نزدیک خالص اور بے میل انسانیت ہی

فطرۃ اللہ کی محافظ ہے، اور سچا دین اگر ہے تو یہی ہے۔ اسلام کی تعلیمات کا لب لباب قرآن مجید کی آیت:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

ترجمہ: ''وہ ذات جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ، تاکہ غالب کرے وہ اس دین حق کو تمام ادیان پر، اگرچہ مشرکین اس کو بُرا ہی سمجھیں''۔

(سورۃ الصف، ۶۱:۹)

قرآن کا مقصود اصلی سب دینوں سے اعلیٰ دین یعنی سب فکروں سے بلند تر فکر یا سب سے بلند بین الاقوامی نظریہ جو زیادہ سے زیادہ جامع ہو، پیش کرنا اور اس پر عمل کرانا ہے، یہ دین دوسرے ادیان کو مٹانے نہیں آیا۔ یہ سب ادیان کی بُنیادی صداقتوں کو تسلیم کرتا ہے اور سب قوموں کے وُجود کو مانتا ہے۔ لیکن اس کا یہ کہنا ہے کہ تاریخ میں یہ ہوتا آیا ہے کہ ایک قوم ایک مذہب اختیار کرتی ہے اور جوں جوں زمانہ گُزرتا ہے وہ اسے اپنے رنگ میں رنگتی جاتی ہے، اور اس طرح انسانی دین قومی دین بن جاتا ہے، لیکن اس قوم کا اصرار ہوتا ہے کہ اس کا دین ہی ساری انسانیت کا دین ہے اور صرف یہی قوم انسانیت کی حامل اور نمائندہ ہے، بے شک ابتداء میں ان کا یہ فکر دین انسانی ہوتا ہے اور اس میں ہر رنگ اور نسل والے کو مقام مل جاتا ہے، لیکن آہستہ آہستہ یہ قومی بن جاتا ہے اور آخر نوبت یہاں تک پہنچتی کہ ہر فرد یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں اور صرف میں ہی حق پر ہوں، باقی سب لوگ گمراہ اور کافر ہیں، ہمارے نزدیک وہ دین جو ساری انسانیت کا شیرازہ بند بن کر آتا ہے، ایک وقت آتا ہے کہ وہ انتہائی انتشار اور نزاع کا باعث بن جاتا ہے، قرآن اسی کو کفر قرار دیتا ہے۔

قرآن نے یہ کیا کہ ان تمام قومی مذاہب کو جو انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا سبب بن گئے تھے، مردود قرار دیا، اور یہ تلقین کی کہ خُدا کا سچا مذہب وہ ہے جو خُدا سے زیادہ قریب ہو اور خُدا سے قُربت کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرقوں اور قوموں سے بالاتر ہو کر ساری انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لے، ہمارے نزدیک قرآن نے تمام اقوام، ادیان اور مذاہب کے مرکزی نکات کو جو کل انسانیت پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ یکجا کیا، اور ساری دنیا کو

یہ دعوت دی کہ صرف یہی ایک بُنیاد ہے جس پر صحیح انسانیت کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ اگر یہودیوں کی قوم میں انسانیت کا فقدان ہے تو وہ خواہ اپنے منہ سے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (ہم خُدا کے بیٹے اور اس کے محبوب) بنیں، گمراہ ہیں۔ اگر عیسائی اس سے خالی ہیں تو ان کا عیسیٰ علیہ السلام کو خُدا کا بیٹا ماننا، کسی کام نہ آئے گا، اور اگر ہندوؤں میں انسانیت کی کمی ہے تو ان کا "پوتر" (پاک) ہونا محض خام خیالی ہے، اسی طرح مسلمانوں پر بھی اس حکم کا اطلاق ہو سکتا ہے، قرآن ایک میزان ہے جس میں سب تولے جا سکتے ہیں۔

(میرے نزدیک اصل دین یہی ہے باقی سب "رُسوم" اور روایتیں ہیں، قرآن کا مقصد انسانیت کو ان "رُسوم" اور روایتوں کے بندھنوں سے آزاد کرانا ہے، بدقسمتی سے ہر قوم نے ان "رُسوم" کو اصل سمجھ لیا، اور ان کے پیچھے لوگ ایک دوسرے سے لڑنے لگے، قرآن کا سچا ماننے والا وہ ہے جو ان بے روح "رُسوم" کے خلاف جہاد کرے، اور خلوصِ دل سے "رُسوم شکن" (رُسوم توڑنے والا) ہو، قرآن کا ماننے والا موحد ہوتا ہے اور اس کی عادت واقعی ترک رُسوم ہے۔ جب "رُسوم" مذہب کا درجہ اختیار کر لیں اور مذہب کا یہ لباس، مظہرِ وجود کی بجائے ننگ وجود ہو جائے تو اس وقت ان "رُسوم" کا مٹانا قرآن کے ماننے والے کا فرض ہو جاتا ہے۔

(میں ان معنوں میں پکا موحد ہوں اور ترک "رُسوم" کا دل و جان سے حامی ہوں، لیکن میں ترک رُسوم کا بھی ایک حد تک قائل ہوں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ زندگی جب اس دنیا میں اسباب و حالات کا جامہ پہنتی ہے تو اسے ممکن اور موجود ہونے کے لئے لامحالہ رُسوم اختیار کرنی پڑتی ہیں، ان رُسوم کے بغیر زندگی زمان و مکان کے اس دائرے میں وجود پذیر نہیں ہو سکتی، لیکن ہونا یہ چاہیے کہ ان رُسوم کو رُسوم ہی سمجھا جائے، لباس، لباس ہی رہے اسے صاحب لباس نہ مان لیا جائے لیکن جب لباس پر ہی زور دیا جائے اور رسوم ہی اصل مذہب کا درجہ اختیار کر لیں اور اکثریت "قبلہ" کو "قبلہ نما" سمجھنے سے عاری ہو جائے تو پھر یہ رُسوم بت بن جاتی ہیں، اور جس طرح کبھی لات و ہبل کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا تھا انہیں بھی توڑ پھوڑ دینا پڑتا ہے، قرآن اسی توحید کی دعوت دیتا ہے اور اس کے خلاف تمام شعائر کو کفر سمجھتا ہے۔

یہ شعائر کفر ہمیشہ پتھر اور سونے چاندی کے بت نہیں ہوتے، ہماری رُسوم، ہمارے اخلاقی معیار، ہمارے آداب و اطوار اور ہمارے نام نہاد مذاہب بھی ایک وقت میں بُت بن جاتے ہیں

اور جس طرح پہلے کبھی پتھر کے بُت غیراللہ بن گئے تھے اسی طرح جب رُسوم کے یہ بت غیراللہ بن جائیں تو ان کے خلاف بھی قرآن جہاد کی تلقین کرتا ہے ،اس لئے ضروری ہے کہ انسان ان رُسوم میں پڑ کر یہ بھول نہ جائے کہ سارے انسان ایک ہیں اور قوموں ،فرقوں اور طبقوں کی تقسیم حقیقی نہیں ،در اصل سب کی اصل ایک ہے ،ساری انسانیت ایک ہے ،کل کائنات ایک ہے ،اور یہ وُجود ایک ہی ذات کا پَرتَو یا فیضان ہے ۔ہر ذرہ اسی وُجود کا ظہور ہے اور ہر انسان میں اسی نور کی جلوہ گری ہے ۔

قوموں کی زندگی میں ایک ایسا دور آتا ہے جب تعینات ،قوانین اور نام نہاد مذاہب پردے بن کر خُدا اور بندے کے درمیان حائل ہوجاتے ہیں تو اس وقت فطرت انسانی ان کے خلاف بغاوت کرتی ہے ۔اور نئے دور کا ظہور ہوتا ہے ،جس میں ہر فرد کا رشتہ پھر نئے سرے سے روحِ کُل سے جُڑ جاتا ہے ۔یہ عمل تاریخ میں برابر ہوتا رہتا ہے اور جس دن انسانیت اپنے اس تقاضۂ زندگی سے محروم ہوگئی ،وہ دن انسانیت کی موت کا دن ہوگا ،یہ روح ہے قرآنی تعلیمات کی ،میں انسانیت تو کیا کل کائنات کی وحدت کا قائل ہوں ،لیکن جس طرح کائنات کی کثرت صاحب نظر کو پریشان نہیں کرتی اور وہ جانتا ہے کہ ان سب مختلف شکلوں میں ایک ہی جلوہ عکس ریز ہے ،اسی طرح مجھے انسانوں کا قوموں ،گروہوں ،اور افراد میں بٹا ہونا وحدت انسانیت کے منافی نظر نہیں آتا ۔ہر فرد اپنی جگہ ایک مستقل اکائی ہے ،جماعت بھی ایک مستقل اکائی ہے ،جو افراد پر مشتمل ہے ؛اسی طرح ہر ایک قوم اپنی جگہ مستقل وُجود رکھتی ہے ،اور انسانیت سب قوموں کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے ،فرد کا صالح ہونا ،اس بات پر منحصر ہے کہ وہ جماعت کا اچھا جُزو ہو ،اچھی جماعت وہ ہے جو قوم سے تضاد نہیں ،مطابقت رکھتی ہو؛اچھی قوم اسے کہیں گے جو کل انسانیت کے جزو صالح کا حکم رکھتی ہو،انفرادیت ان معنوں میں کہ ہر فرد ، ہر جماعت اور ہر قوم ایک دوسرے سے برسرنزاع ہو ،غلط اور مردود ہے ،حاصل مطلب یہ ہے کہ میں وحدتِ انسانیت کو مانتا ہوں اور قرآن مجید کو اسی وحدت کا شارح سمجھتا ہوں ۔میرے نزدیک قرآنی تعلیمات کا یہی مقصود ہے کہ اس وحدت کا قیام عمل میں آئے اور لوگ عقیدۃً عِلماً اور عملاً موحد بن جائیں ۔

مقالہ نمبر (۴)

﴿نظریہ تمدّن﴾

ہمارے نزدیک تمدّن انسان کا فطری تقاضہ ہے اس کی سوتیں خود انسان سے اندر سے پھوٹتی ہیں۔تمدّن کی تشکیل کے لئے انسان کسی ماہر کی مدد کا محتاج نہیں ،ایک جزیرہ میں اگر ایک مرد اور عورت اکیلے چھوڑ دیئے جائیں تو وہ اپنی طبیعت کے تقاضے سے خود تمدّن کی عمارت کھڑی کرلیں گے۔

یہ تمدّن اسی وقت تک اچھا رہتا ہے ،جب تک یہ انسانوں کی اجتماعی اور انفرادی ضروریات پوری کرتا ہے،لیکن جب کسی قوم میں انسانوں کا ایک مخصوص طبقہ تو تمدّنی لحاظ سے بہت آگے بڑھ جائے ،اور دوسرے لوگ جو تعداد میں بہت زیادہ ہوں ،بہت پیچھے رہ جائیں ،تو پھر اس تمدّن کو گھن لگ جاتا ہے اور قدرت یا زمانہ کا یہ تقاضہ ہوتا ہے کہ اس تمدّن کو جو فرسودہ ہوگیا ہے ،برباد کردیا جائے ،قوم کے ایک محدود طبقے کی اس غیر فطری ترقی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لاکھوں اور کروڑوں انسان تو معمولی معاش کی ضروریات کو ترستے ہیں اور چند ایک کے پاس بہت دولت جمع ہوجاتی ہے ۔ان حالات میں قوم کو روگ لگ جاتا ہے ۔افراد کی صلاحیتیں بے کار ہو جاتی ہیں عیش پرستی عام طور پر پھیلنے لگتی ہے ،عمومی مفاد کا کسی کو خیال نہیں رہتا۔نفسی نفسی کا معاملہ ہوتا ہے ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنا پیٹ بھرے ،اپنی خواہشات کو پورا کرے ،خواہ ہمسایہ فاقوں کے مارے مرتا جائے ،جب کوئی قوم اغیار کے اس نرغے میں گرفتار ہو جاتی ہے تو پھر انقلاب کا آنا ایک حتمی امر ہوتا ہے۔

اگر قوم کے سارے طبقے اس روگ کی وجہ سے مفلوج نہ ہو گئے ہوں اور قوم کے جسم عمومی میں زندگی کا گرم خون موجود ہو تو زوال آمادہ طبقے کی جگہ لینے کے لئے قوم کا دوسرا طبقہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے ،وہ پہلوں کو زبردستی یا صلح و صفائی سے بساط سیاست سے الگ کرتا

ہے۔اور خود قوم کی عنان اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔یہ طبقہ اپنا نیا تمدّن بناتا ہے اور پہلا تمدّن پھٹے ہوئے لباس کی طرح نا قابل استعمال قرار پاتا ہے،لیکن اگر زوال کے جراثیم قوم کے سارے جسم میں اپنا کام کر چکے ہوں اور کسی طبقے میں بھی اتنی جان نہ ہو کہ وہ قوم کی کشتی کا کھیون ہار ہو سکے اور زمانے کے ریلے کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھے،تو باہر سے کوئی دوسری قوم چڑھ آتی ہے وہ بے جان تمدّن کو جو اپنی زندگی کے دن گزار چکا ہوتا ہے،ٹھکانے لگاتی ہے،حکمرانوں کو تہ تیغ کرتی ہے، ملک کے انتظام کے نقشے بدل ڈالتی ہے۔اب نئے طبقے پیدا ہوتے ہیں اور فروغ پاتے ہیں، نیا تمدّن بنتا ہے ،اجتماع، معیشت اور سیاست کے نئے اُصول وضع ہوتے ہیں۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ قوموں کے عروج وزوال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جب کسی قوم کے کمانے والے طبقوں کی کمائی پر نہ کمانے والے طبقے قبضہ کر لیں، یا ان کی کمائی کا بڑا حصہ خود ہتھیا لیں ،تو یہ حالت انقلاب کی پیش خیمہ ہوتی ہے''۔(1)

ایک گروہ تو انقلاب کا علمبردار بن کر آگے بڑھتا ہے، دوسرا گروہ جو تعداد میں بہت زیادہ ہوتا ہے،انقلاب کا ہمدرد بن جاتا ہے،اس میں شک نہیں کہ ان ہمدردوں کے اخلاق واطوار کا اثر انقلاب کے مظاہر پر پڑتا ہے،لیکن اس کا تعلق صرف ظاہری شکل سے ہوتا ہے، اصل انقلاب کی روح کا ترجمان پہلا ہی طبقہ ہوتا ہے ،رسول اکرم ﷺ کے صحابہؓ (سابقین اولین) اسلام کی انقلابی روح کے ترجمانِ حقیقی تھے ،عربوں کی تقریباً ساری کی ساری آبادی اس تحریک کی ہمدرد بن کر شریک ہوئی اور انہوں نے اسلام کی ظاہری شکل و صورت کو اپنے رنگ میں رنگا بھی،لیکن جہاں تک تعلیمات اسلام کا جوہر اصلی ہے،وہ رسول اللہ ﷺ کا اُسوہ اور آپ کے قریب ترین صحابہ ؓ کا عمل ہے،کیونکہ حقیقت میں عالمگیر انقلاب کی رُوح رواں یہی پاک ہستیاں تھیں۔

انقلاب کے لیے بڑی تیاری کی ضرورت ہے۔انقلابی جماعت کو پہلے اپنے فکر کی تہذیب اور اس کا استحکام کرنا پڑتا ہے تا کہ انقلابی فکر ان کے ذہن میں راسخ ہو جائے اور انقلابی عمل کے لیے ان کی تربیت بھی مکمل ہو، رسول اکرم ﷺ نے پورے تیرہ برس تک

مکہ میں اس فکر کی تبلیغ کی اور جو اس فکر کو دل و جان سے مان گئے تھے، ان کی جماعت بندی کی، اور پھر اس جماعت کی تنظیم و تربیت میں شب و روز منہمک رہے، اور آخر میں جب آپ نے دیکھا کہ مکہ کی فضاء ناساز گار ہے، اور یہاں اس نئی جماعت کو اپنی مستقل سیاسی تشکیل میں دقتیں ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اور مدینہ کو اپنا نیا انقلابی مرکز بنایا۔

قریش کی انقلابی جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے اثر سے خود اپنوں کو جوان کے بھائی بند اور سگے عزیز تھے، لیکن وہ نئے انقلاب کی راہ میں حائل تھے ختم نہ کرتی؛ تو اسلام کبھی یہ حیثیت اختیار نہ کرتا اور نہ یہ ساری دنیا کو اپنا پیغام سنا سکتا، ضرورت ہے کہ آج مسلمان اپنے پیغمبر علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کی اہمیت کو سمجھیں اور اپنی قوم کے ان طبقوں کو جو جونک کی طرح قوم کے خون کو پی رہے ہیں۔ انہی مردود قرار دیں، یہ لوگ خواہ ہمارے اپنے جگر کے ٹکڑے ہوں، یا ہمارے بزرگ، ان کا وُجود ساری قوم کے لیے وَبال بن رہا ہے، ہمارے یہ رجعت پسند طبقے جس کھوکھلے تمدُّن کو تھامے ہوئے ہیں، وہ انسانیت کے لیے ایک روگ ہے۔ ہماری قوم کے نوجوان انقلابی گروہ کا فرض ہے کہ وہ ان کے تسلُّط سے قوم کے عوام کو رہائی دلائے، جب تک یہ نہ ہوگا ہماری قوم کی زبوں حالی ختم نہیں ہونے کی۔

یہ بات بالکل صاف اور واضح ہے، فرض کیجئے ایک گھر میں کمانے والے کم ہوں اور کھانے والے زیادہ، وہ گھر ضرور تباہ ہو جائے گا۔ اسی طرح جس تمدُّن میں کمانے والے کم ہوں اور کھانے والے زیادہ، وہ تمدُّن فاسد ہو جاتا ہے، ہر انسان کو بغیر کسی معقول عذر کے اپنی روزی خود کمانی چاہیے، دوسروں کی محنت پر جینا، جینا نہیں، بلکہ گلچھرے اڑانا ہے، یہ زوال کا راستہ ہے۔ اسی طرح اگر کمانے والے تو بڑی محنت سے کمائیں، لیکن ایک شخص یا چند ایک اشخاص جن کے ہاتھ میں انتظام ہو، وہ ان کمانے والوں کی کمائی کا بڑا حصہ اپنے انتظام کے عوض مار لیں، تو ایسا تمدُّن بہت دنوں نہیں جی سکتا اور انسانیت کو اس سے کبھی فلاح نہیں ملتی۔

انسانیت کی تباہی اور زبُوں حالی کا اکثر یہ سبب ہوتا ہے کہ عام جمہور کو کھانے کو کچھ

نہیں ملتا، وہ فاقے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس طرح انہیں محتاج رکھ کر، ان کو معاشی اور اخلاقی حیثیت سے تباہ کیا جاتا ہے، معاشی تباہ حالی سے یہ بھی ہوتا ہے کہ خالی پیٹ کی فکر میں انسانوں کو کسی اور چیز کی سُدھ بُدھ نہیں رہتی، اور انسانی زندگی کی جو اعلیٰ ضرورتیں ہیں، وہ سب بہم نہیں پہنچتیں اور اس طرح انسانیت ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانیت کے اعلیٰ تقاضے بہت حد تک معاشی اسباب و حالات سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ انسان کی معاشی ضروریات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے، لیکن ساتھ ہی انسانیت کے اس رُخ کو بھی جو اخلاقی اور فکری شکل میں ظاہر ہوتا ہے، تشنہ نہ چھوڑا جائے۔

اخلاق اور فکر کے بغیر کوئی تمدُّن پائیدار نہیں ہوتا۔ چنانچہ سرمایہ داروں پر جہاں یہ الزام ہے کہ انہوں نے انسانیت کے بہت بڑے حصے کو محتاج رکھ کر انہیں انسانیت کی سطح سے نیچے گرا دیا، ان پر دوسرا الزام یہ بھی ہے کہ اس بڑے حصے میں سے ایک گروہ ایسا بھی تھا جو انسانی اخلاق و فکر کو اپنی صلاحیتوں سے بڑی ترقی بخش سکتا تھا، لیکن سرمایہ داروں نے اسے روٹی کا محتاج کر کے اس سے محروم کر دیا، چنانچہ ان کی وجہ سے انسانیت کی ترقی مجموعی طور پر رُک گئی۔ جب کسی وجہ سے قوم کا ذہین طبقہ جو اخلاق اور افکار کا مالک ہوتا ہے، اپنے فرض منصبی سے غفلت برتتا ہے، تو اس کی یہ صلاحیتیں ذلیل کاموں میں صرف ہونے لگتی ہیں، ان کی ذلت کا پہلا قدم تملُّق ہے، یعنی حکمران طبقے کی خوشامد کر کے ان سے زیادہ سے زیادہ وصول کرنے کی کوشش، اور یہی مرض ہے جو آگے چل کر ان کو غیر اللہ کی عبادت کا داعی بنا دیتا ہے، یہی جذبہ بُت پرستی سکھاتا ہے اور اس منزل میں انسانیت کے اعلیٰ خصائل سارے تباہ ہو جاتے ہیں، اور انسانیت فاسد ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی مسخ شدہ انسانیت کے برباد کرنے کے لیے قدرتی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں، پھر اس برباد شدہ انسانیت کے کھنڈرات پر صالح انسانوں کی آبادی بستی ہے۔

اس زوال آمادہ اور فرسودہ تمدُّن کی تباہی کے لئے انسانوں کا ایک نیا گروہ اُٹھتا ہے، قدرتی اسباب اس کے مؤیّد ہوتے ہیں اور اس گروہ کی قیادت ایک شخص کو ملتی ہے جو انقلاب کا امام ہوتا ہے۔ ان آئمہؑ انقلاب کا ایک اُونچا درجہ ہے، جنہیں انبیاء علیہم السلام کا

نام دیا جاتا ہے، انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے نظام میں انسانی فطرت کی زیادہ رعایت ہوتی ہے اس لئے یہ نظام دیر تک قائم رہتا ہے۔

قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے جس قدر قصے ہیں، وہ اسی انقلاب کا نمونہ پیش کرتے ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے ہونے والا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کے اس عالمگیر انقلاب کے داعی تھے' آپ کے اصحابؓ خلافت راشدہ کے دور میں اس کو ایک درجہ تک عالمگیر بنا دیتے ہیں، یعنی اس انقلابی حکومت کا دائرہ اتنا وسیع کر دیتے ہیں کہ دنیا کی ساری رجعت پسند حکومتیں جمع ہو کر بھی اس انقلابی حکومت کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتیں، قرآن کا یہ انقلاب ختم نہیں ہوا، بلکہ یہ ہمیشہ برسر پیکار رہے گا۔ کیونکہ کوئی زمانہ ایسا نہیں آ سکتا، جس میں رجعت پسندی کی طاقتیں بالکل معدوم ہو جائیں۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

''قرآن کی رُو سے رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا مقصد ہی یہی تھا کہ ان کے ذریعے خُدا کے دین کو باقی سب دینوں پر غالب کر دیا جائے اور اسلام انسانوں کو ایک ایسا نظام حیات دے جو سب نظاموں سے بہتر اور اعلیٰ ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا یہ مقصد اس صورت میں پورا ہوا کہ قیصر و کسریٰ کا نظام، جو ایک حد تک ساری دنیا پر حاوی تھا، پاش پاش ہو گیا اور انسانیت کو قیصریت اور کسرویت دونوں سے نجات ملی۔''(2)

قیصر و کسریٰ کے نظام کو تباہ کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اس کی بناء جمہور کی لوٹ کھسوٹ (EXPLOITATION) پر تھی، بادشاہ، اس کے امیروں اور مذہبی طبقوں کا کام یہ رہ گیا تھا کہ وہ رعیت کی خون پسینہ ایک کر کے کمائی ہوئی دولت سے عیش کریں۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

''عجم اور روم کے شہنشاہ اس قدر تعیش میں مبتلا ہو گئے تھے کہ اگر ان کا کوئی درباری لاکھ روپے سے کم قیمت کی ٹوپی یا کمر بند پہنتا تو اسے ذلیل سمجھا جاتا تھا''۔(3)

www.rahimia.org

لوٹ کھسوٹ کی اس گرم بازاری میں عوام کی حالت حیوانوں سے بدتر ہو گئی تھی، اور پھر اوپر کے طبقوں کو جب بغیر مشقت کے ثروت ملے، تو ان میں ہر قسم کے اخلاقی عُیوب پیدا ہو جاتے ہیں، نہ ان کی صحتیں ٹھیک رہتی ہیں اور نہ ذہنی قویٰ' اور چونکہ ان کی زندگی کا مقصد محض رندی و ہوسنا کی بن جاتا ہے، اس لیے ان میں آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ اور شاہی دربار سازشوں کا مرکز بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس طرح عوام تو بھوک سے بے جان ہو گئے اور ''اشراف'' کو ثروت نے بے کار کر دیا۔ کلیلہ دمنہ کے مترجم ایرانی حکیم ''برزُویہ'' نے اس وقت ایران کی جو حالت تھی اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے صداقت سے ہاتھ اٹھا لیا ہے، جو چیز مفید ہے وہ موجود نہیں ہے اور جو موجود ہے وہ مضر ہے۔ جو چیز اچھی ہے، وہ مرجھائی ہوئی ہے، اور جو بری ہے وہ سرسبز ہے۔ دروغ کو فروغ ہے، اور نیکی بے رونق ہے، علم پستی کے درجہ میں ہے اور بے عقلی کا درجہ بلند ہے۔ بدی کا بول بالا ہے۔ اور شرافت نفسی پامال ہے۔ محبت متروک ہے اور نفرت مقبول ہے۔ فیض و کرم کا دروازہ نیکوں پر بند ہے اور شریروں پر کھلا ہے۔ حکام کا فرض صرف عیاشی کرنا اور قانون توڑنا ہے، مظلوم اپنی ذلت پر قانع ہے اور ظالم کو اپنے ظلم پر فخر ہے، حرص اپنا منہ کھولے ہوئے ہے اور دور و نزدیک کی ہر چیز کو نگل رہی ہے۔ تسلط لائقوں سے نالائقوں کی طرف منتقل ہو گیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا مسرت کے نشے میں یہ کہہ رہی ہے کہ: میں نے نیکی کو مقفل، اور بدی کو رہا کر دیا ہے''۔(4)

کم و بیش یہی حالت روم کی تھی، شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں ان کا یہ روگ بڑھتا ہی چلا گیا، آخر یہ ہوا کہ خُدا اور اس کے مقرب فرشتوں کی آتش غضب بھڑکی اور نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) مبعوث ہوئے، جن کی زبان سے قیصر و کسریٰ کی عادات کی مذمت فرمائی گئی اور ان کے ذریعہ دونوں سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا گیا، اور ان کی جگہ ایک اور نظام نافذ ہوا، جو عدل و مساوات پر مبنی تھا، چنانچہ اُوپر کے لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے یا تو سرے سے ناپید ہو گئے یا ان کے ہاتھوں سے اقتدار چھن گیا، قُدرتی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ملک کے عوام کو سر اُٹھانے کا موقع ملا اور اس واقعہ پر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مصر، شام، افریقہ اور ایران میں وہاں کے عوام جماعتی زندگی میں پیش پیش نظر آنے لگے۔

۹ قیصریت اور کسرویت کی عادات کی مذمت، اُن کے نظام کی تخریب اور ایک صالح اور مفید نظام کا نفاذ، قرآن کی تنزیل کا مقصد تھا، جو گروہ اور قوم قیصریت کو اپنا اشعار بنا لے، عوام کی لوٹ کھسوٹ پر ان کی گُزران ہو، اور دادِ عیش دینا ان کی زندگی کا مقصد ہو، قرآن اُن کے خلاف دعوتِ جہاد دیتا ہے۔ قرآن کا یہ پیغام کسی جماعت یا قوم کے لیے مخصوص نہیں۔ قرآن ہر ظلم کا انکار کرتا ہے۔ اور ہر مظلوم کے دل میں یہ ولولہ اور حوصلہ پیدا کرتا ہے کہ وہ ظلم کو مٹانے اور ظالم کو ظُلم سے باز رکھنے اور اس کے اصرار پر اس کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہو۔

۱۰ الغرض جو کچھ ایران اور روم پر گزری تھی، کم وبیش وہی اسلامی ہند کو پیش آیا، سلاطین ختم ہو گئے، امراء کا وُجود نہ رہا، اہلِ صنعت اور جمہور بے سری فوج کی طرح تتر بتر ہو گئے، شاہ صاحبؒ کا پیغام قوم نے نہ سنا اور جنھوں نے سنا بھی وہ عام زوال کی رَو کو روک نہ سکے، شاہ صاحبؒ کی جماعت نے اس رَو کو تھامنے کی بے شک کوشش کی، لیکن ایک عام طوفان کے مقابلہ میں چند مخلص افرا کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں، اور آخر کار ہندوستان کو نئے سیلاب نے زیرِ آب کر لیا۔

نیا دور ہمارے لیے بہت سی مصیبتیں لایا، ہم اس ملک کے مالک تھے، آج ہم دوسروں کے غلام ہیں، ہمارے ہاتھ میں سیاسی اقتدار اور معاشی ثروت کی باگ ڈور تھی، اس سے ہم محروم ہو گئے، ہمارے اشراف علم وفضل کے محافظ تھے، علم وفضل اب دوسروں کے ہاں جا چکا ہے، ہم آسمان پر تھے لیکن تقدیر نے آج ہمیں گڑھے میں دھکیل دیا ہے، ہمارے لیے یہ انقلاب کوئی معمولی انقلاب نہ تھا۔

۱۱ ہم شکست کھا گئے اور ہمیں اس شکست کا کُھلے دل سے اعتراف کر لینا چاہیے، لیکن یہ شکست ہمارے تمدُّن اور نظام کی شکست ہے، ہمارے فکر کی شکست نہیں، اس فکر نے ایک زمانے میں وہ ڈھانچہ اختیار کیا، اب وہ ڈھانچہ ٹوٹ چکا ہے۔ جہاز ڈوبنے کے بعد محض اس خیال سے کہ کبھی یہ جہاز ہمارا تھا اور اس کے بل پر ہم سمندر کے سینہ پر دوڑتے پھرتے تھے۔ جہاز کے تختوں سے چمٹے رہنا، دانشمندوں کا طریقہ نہیں، جہاز ڈوب گیا، ہم نے بس بھر کوشش کی کہ وہ نہ ڈوبے، ہمارے ساتھیوں نے تو اس جہاز کو بچانے کے لیے

www.rahimia.org

اپنی جان تک دینے میں بھی دریغ نہ کیا اور آخر وقت تک اس کی خاطر سمندر کی موجوں اور آندھیوں کے جھکڑوں سے لڑتے رہے، لیکن اب جب کہ یہ جہاز سمندر کے نیچے جا چکا ہے اور اس کے تر آنے کی اُمید موہوم تک باقی نہیں رہی، اس جہاز پر آنسو بہاتے رہنا، فہم و فراست کے دیوالیے پن کے مترادف ہے، عقل اور ہمت تو یہ تقاضہ کرتی ہے کہ جس طرح ہم نے پہلے جہاز بنایا تھا، اب ایک دوسرا جہاز بنا کر کھڑا کر لیں، لیکن جب بھی ہم نیا جہاز بنائیں گے تو ظاہر ہے اس کے بنانے میں پچھلے جہاز کے فن، مہارت اور نمونہ سے بڑی مدد لی جائے گی۔

القصہ ہمارا تمدُّن، ہمارا نظام زندگی اور ہمارا قانون جو ہم نے بھی اس سیلاب کی نذر کیا ہے اب بجنسہٖ دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتے۔ ان کی حیثیت اب ایک تاریخی واقعہ کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ایک عرصہ تک ہماری قومی اور ملی شخصیت نے اپنے وُجود کو ان مظاہر میں جلوہ گر کیا تھا اور یہ چیزیں ہمارے باطنی وُجود کے لیے علامات سی بن گئی ہیں، اس لئے ان کا کلی انکار بھی کسی طرح ممکن نہیں۔ زندگی کا سلسلہ اٹوٹ ہے اور جس طرح پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے زندگی بھی ہمیشہ اپنا تسلسل قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ قوم زندگی کے جن مراحل کو طے کر چکی ہوتی ہے، نیا نظام بشرطیکہ وہ صالح ہو، ان مراحل سے آگے کی طرف بلندی کی راہ دکھاتا ہے لیکن ان مراحل سے کلیۃً انکار نہیں کرتا، البتہ ان کے برے اجزاء کو ضرور الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

لہٰذا برصغیر کے مسلمانوں کو بھی اسی چیز کی ضرورت ہے، ان کو چاہئے کہ وہ ماضی کی وراثت کا جائزہ لیں! کھوٹے کھرے کو پرکھیں!، کھوٹے کو قومی وُجود سے نکال کر باہر کریں اور جو کھرا ہے اس کو سینہ سے لگائیں اور اردگرد جو نئے عناصر وُجود میں آ چکے ہیں، انہیں اپنائیں اور اپنے قومی مزاج میں ان کو اس طرح سموئیں کہ وہ ان کے لیے مُوافق بن جائیں اور اس طرح اپنے لیے نیا تمدُّن، نیا نظام حیات اور نیا قانون وضع کریں۔ بے شک اس تمدُّن، نظام، اور قانون کی روح وہی ہو گی جو قرآن اور اسلام کی روح ہے، ہاں لباس کا فرق ضرور ہو گا، لیکن کیا قرآن اور اسلام کی روح اتنی ہی عام نہیں، جتنی کہ خود انسانیت ہے؟ اور کیا انسانیت کو ہر زمان و مکان میں ایک ہی لباس کا پابند بنانا ممکن ہے؟

حوالہ جات:

(1) حجۃ اللہ البالغہ، باب سیاسۃ المدینہ، جلد اول، ص ۹۴، مطبوعہ بیروت۔
(2) حجۃ اللہ البالغہ، باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم، ص ۲۲۱
(3) ایضاً
(4) کلیلہ دمنہ، باب برزویہ المتطبب، ص ۴۸، مطبوعہ بیروت۔

www.rahimia.org

مقالہ نمبر(۵)

﴿غلبۂ دین کی عصری اہمیت﴾

ایک معرکۃ الآراء خطاب

ہندوستان کی آزادی کی ''تحریک ریشمی رومال'' کے حوالہ سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ کے حکم پر مولانا عبید اللہ سندھیؒ 1915ء میں ہندوستان سے کابل تشریف لے گئے، آپ نے ہندوستان کی آزادی کے لئے انتھک جدوجہد اور کوشش کی، اس سلسلہ میں آپؒ نے جو صعوبتیں برداشت کیں، ان میں سب سے اہم آپؒ کی چوبیس سالہ جلاوطنی ہے۔ اس دوران آپ کو ناگفتہ بہ حالات سے گزرنا پڑا، آپ نے جدو جہد آزادی کے لئے کئی ممالک کا سفر اختیار کیا، چنانچہ آپؒ استنبول (ترکی)، سوئیزرلینڈ ہوتے ہوئے آخر میں مکۃ المکرمہ پہنچے، اور بارہ سال تک جوارِ حرم میں قیام فرمایا اور حرمِ پاک کی تجلیات و انوارات سے فیض یاب ہوئے، اس دوران آپ نے ہندوستان کی مسلمانوں کے مستقبل کی تعمیر و تشکیل نو کے لئے جو کچھ سوچا اور سمجھا تھا اسے لے کر 1939ء میں ہندوستان تشریف لائے اور اہل وطن کو دین کی تعلیمات کی اساس پر غور وفکر کی دعوت دی، حضرت مولانا سندھیؒ نے مارچ 1939ء میں کراچی کے ساحل پر اُترنے کے بعد جو اہم ترین خطاب فرمایا وہ درج ذیل ہے:

محض وطن اور خاندان کی محبت مجھے اس عمر میں ہندوستان کھینچ کر نہیں لائی، میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں، زندگی کے معلوم نہیں کتنے دن اور ہیں، مجھے اگر آرام او رسکون کی خواہش ہوتی تو عمر کے یہ آخری دن حرم پاک ہی میں اطمینان سے گزارتا اور اس مقدس سرزمین میں سپرد خاک ہونا پسند کرتا، میں اس بڑھاپے میں اور اس قدر ضعف و کمزوری کے باوجود آپ لوگوں کے پاس اس لیے پہنچا ہوں کہ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔

آپ کے بزرگوں (حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور ان کی جماعت) نے مجھے باہر بھیجا تھا، باہر رہ کر جو کچھ بھی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کر سکتا تھا، میں نے کی، اسی

اَثنا (عرصہ) میں بہت کچھ دیکھا، اور عجیب عجیب حالات سے مجھے گزرنا پڑا، میں جو کچھ تم سے کہنا چاہتا ہوں، اسے غور سے سنو، میں نے اپنی زندگی کے چوبیں برس ہندوستان سے باہر گزارے ہیں، اس طویل مدت میں میں نے محض ملکوں کی سیاحت نہیں کی، اور چیزوں کو صرف ایک تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھا، بلکہ بڑی بڑی مُہموں میں خود شریک رہا ہوں، اس جدوجہد میں کبھی اپنے ارادوں میں کامیاب رہا، تو اکثر بڑی تلخ اور جانگداز ناکامیوں کا منہ بھی دیکھنا پڑا، مجھے سلاطینِ اسلام کے مشوروں میں شریک ہونے کا بھی موقع ملا اور میں ان سپہ سالاروں کا رفیق بھی رہا، جو بڑی بڑی سلطنتوں کے رُکن رکین تھے اور جن کے ہاتھوں دنیا کے عظیم الشان معرکے سر ہوئے۔ بادشاہوں اور سپہ سالاروں کے علاوہ میں جس ملک میں گیا اور جہاں بھی رہا، میں نے وہاں کی ہر چیز آنکھیں کھول کر دیکھی، میں نے ان ملکوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا۔ اور وہاں کے رہنے والوں کے موجودہ حالات کو بھی سمجھنے کی کوشش کی۔ میرا یہ مطالعہ سرسری نہیں اور میری باتوں کو تم وقتی تاثرات اور عارضی ہیجانات کا نتیجہ نہ سمجھنا، میرے پیچھے تجربات اور مشاہدات کی ایک وسیع دنیا ہے، اور میں نے اقوام کی تاریخ کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش کی ہے۔ میرے حالات مجھ سے کُرید کُرید کر پوچھو! اور میرے نتائج کو توجہ سے سنو! اور ان پر غور کرو! میں کوئی بات تم سے چھپانا نہیں چاہتا، میرا علم، میرا مطالعہ، میرے تجربات اور میرے افکار وقفِ عام ہیں۔

میری آنکھوں نے زندگی کے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں، میرے سامنے بڑی بڑی سلطنتیں تباہ ہوئیں، بادشاہ، سپہ سالار اور امراء بُری طرح قتل کیے گئے، وہ طبقے جو علم و حکمت اور عزت و دولت کے نشے میں ذہنی مسرتوں اور جسمانی آسودگیوں میں مست تھے، زمانے کی ایک ٹھوکر میں ذِلّت کے عمیق گڑھوں میں گرے ہوئے نظر آئے، نہ کوئی ان کے علم کا قدردان رہا اور نہ ان کی عزت کا پُرسانِ حال۔

میں نے پُرانے تمدّنوں کی بُنیادوں کو اپنی نظروں سے کُھدتے دیکھا، اور وہ نظامِ فکر جن کو ان کے ماننے والے لازوال جانتے تھے، اور ان میں ایک ذرا سی تبدیلی ان پر گراں گزرتی تھی، میں نے ان نظاموں کے محترم و مقتدر علمبرداروں کو اپنے وطنوں سے دور

www.rahimia.org

محرومی و بے کسی میں دربدر خاک چھانتے دیکھا ہے۔ میں نے انسانی نسلوں کو فنا ہوتے، بستیوں کو اُجڑتے، تمدّنوں کو مٹتے اور مذہب اور اہل مذہب کو بڑی سفّاکی سے کُچلے جاتے دیکھا ہے۔ خُدا جانتا ہے کہ وہ چیزیں جو مجھے دل و جان سے زیادہ عزیز تھیں اور جن کے لیے میں نے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا تھا، ان چیزوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ختم ہوتے دیکھ کر مجھے کتنا دُکھ ہوا، اور ان دردناک مناظر سے میرے دل و دماغ پر کیا گزری۔ بہرحال خُدا تعالیٰ کی خاص عنایت تھی کہ اس قدر کرب اور اتنی اذیت جھیلنے کے بعد بھی میرے ہوش وحواس بجا رہے، میں زندگی کے ان انقلاب کو برابر دیکھتا رہا، اور ان پر غور خوض بھی کرتا رہا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ جلا وطنی کے آخری ایام میں توفیقِ الٰہی مجھے دیارِ حرم میں لے آئی، اور وہاں میں تقریباً بارہ سال تک رہا، اس طویل مدت میں مجھے اپنے تجربات، تاثرات اور جو کچھ اس وقت تک دیکھا، پڑھا اور سنا تھا، ان پر یکسوئی سے غور کرنے کا موقع ملا، آپ لوگ یقین کریں کہ جہاں تک میری عقل اور سمجھ کی پہنچ تھی، میں نے اپنے افکار کو اس طویل مدت میں خوب جانچا، پرکھا اور ان کے حُسن و قبح میں تمیز کی، میں نے اپنے افکار کو جتنی بھی تاریخ، میں جانتا تھا، اس کی کسوٹی پر کسا، خود اپنے تجربات کی روشنی میں ان کی صوابدید کی اور جو کچھ علم دین، حکمت اور تقویٰ مجھے میسر تھا اور اپنے مُرشدوں اور استادوں کے فیض سے جو بھی بصیرت عطاء ہوئی تھی، اپنے افکار کو ان کے رُوبرو پیش کر کے اپنے نفس کا بھی مُحاسبہ کیا اور ان کے افکار کا بھی پورا پورا جائزہ لیا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ جنہیں ہندوستان کے مسلمانوں کے اہل علم کا بہت بڑا طبقہ اپنا امام اور اُستاد مانتا ہے۔ ان ایسے عظیم المرتبت عالم، حکیم، محدث، مجتہد اور خُدا شناس بزرگ کے علم و حکمت کے ترازو میں میں نے اپنے افکار کو تولا۔ چنانچہ حرم اقدس کی برکتوں اور رحمتوں سے بھری ہوئی سرزمین میں ایک طویل عرصہ تک غور و تامل کرنے کے بعد جب مجھے اس بات پر پورا اطمینان ہوگیا کہ جن افکار و خیالات اور طریق کار کی طرف میری جستجو نے میری رہنمائی کی ہے، اس سے خُدانخواستہ نہ تو میرے اسلام کو گزند پہنچے گا اور نہ میری قوم کو اس کی وجہ سے کسی نُقصان کا اندیشہ ہے، بلکہ مجھے اس پر پورا

یقین تھا کہ اگر میرے وطن والے انھیں راہوں پر چلتے رہے، جن پر وہ اب چل رہے ہیں اور جس عالم بے خبری میں وہ اب تک پڑے ہوئے ہیں، اسی عالم میں مست رہے تو نہ ان کا اسلام بچ سکے گا اور نہ ان کی قومی جمعیت اور ملی حیثیت برقرار رہ سکے گی۔

جب مجھے اس حقیقت پر پورا یقین حاصل ہو گیا اور اس یقین نے کچھ کرنے اور فکر کو عمل میں لانے پر مجبور کر دیا، تو میں نے وطن واپس آنے کا تہیہ کر لیا، بے شک مجھے واپس وطن آنے کے لیے اپنے دشمنوں کے سامنے جھکنا پڑا، لیکن میں نے اپنی طبیعت کے خلاف اس اعترافِ شکست کے صدمہ کو برداشت کیا، کیونکہ اگر ایسا نہ کرتا تو کبھی بھی آپ لوگوں سے آج یوں باتیں نہ کر سکتا تھا، جو کچھ میرے دل و دماغ میں تھا۔ اسے میں ایک رازِ سربستہ کی طرح اپنے ساتھ قبر میں لے جاتا، اور آپ لوگوں کو اِن حقائق سے آشنا نہ کر پاتا۔ جن تک خُدا معلوم میں کن جسمانی مشقتوں، دماغی کاوشوں اور جان کاہیوں کے بعد پہنچا تھا، جن میں میرے خیال میں آپ لوگوں کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح تھی۔

میں ایک عالم گیر انقلاب کے سیلاب کو اپنی آنکھوں سے اُٹھتا دیکھ آیا ہوں، انقلاب کے اس سیلاب نے کئی ایک ملکوں کو اپنی دارو گیر میں لے لیا ہے اور جو ملک اب تک بچے ہوئے ہیں وہ بھی اس سیلاب کے ریلے سے زیادہ عرصہ تک محفوظ نہیں رہ سکیں گے، یہ سیلاب موسمی جھکڑ نہیں کہ آیا اور نکل گیا، یہ عہدِ حاضر کے تاریخی تقاضوں کا قدرتی نتیجہ ہے، انقلاب کا یہ سیلاب پیچھے ہٹنے والا نہیں، دیوارِ چین ہو یا سدِ مارب، یہ سیلاب سب کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا، دنیا ایک نئے طوفان نوح سے دو چار ہوا چاہتی ہے، بادل گھر چکے ہیں، گھٹائیں برسنے ہی کو ہیں، طوفان کو اٹھتے اب زیادہ دیر نہیں لگے گی، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں نہ تو ان طوفانوں کی کچھ خبر ہے اور نہ تم یہ جانتے ہو کہ اگر یہ طوفان بہہ نکلے تو تمہارا کیا حشر ہوگا۔

تمہارے ''علماء'' ہیں کہ ان کی نظریں محض پہلے کی لکھی ہوئی کتابوں میں پھنس کر رہ گئی ہیں، وہ اپنے گرد و پیش دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے، اگر کبھی دیکھتے ہیں تو بس ''کتابی نظر'' سے۔ وہ زندگی سے کٹ چکے ہیں۔ اس لئے جن علوم کو وہ پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، ان علوم میں اس بناء پر نہ تو خود میں کوئی زندگی کی رمق باقی ہے اور نہ وہ علوم پڑھنے اور

پڑھانے والوں میں زندگی کی حرارت اور تڑپ پیدا کرتے ہیں۔

تمہارے ''سیاستدان'' بڑی بڑی اسکیمیں بناتے ہیں، لیکن ان کی نظر خاص طبقوں سے آگے نہیں بڑھتی، وہ قوم اور وطن کا نام لیتے ہیں، مذہب اور کلچر پر زور دیتے ہیں، لیکن ان کی قوم، وطن، مذہب اور کلچر کا تصوّر یا تو سرے سے موہوم ہے، یا ان کا اطلاق ایک خاص طبقہ کے اغراض و مصالح پر ہوتا ہے، یہ لوگ صرف اپنے آپ کی طرف دیکھتے ہیں اور دل ہی دل میں یہ سمجھ لیتے ہیں کہ زمانہ ان کے اشاروں پر سدا حرکت کرتا رہے گا اور لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان کی طرف ہی تکتے رہیں گے۔

قوم کے ''متوسط طبقے'' ہیں کہ وہ روز مرہ کی مادی ضرورتوں اور رسمی مذہب کے چند معمولات کے سوا جن سے انہیں تھوڑا بہت اطمینان مل جاتا ہے کسی اور چیز سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔

باقی رہے ''عوام'' قوم کا غالب حصہ قوم کے جسم کے ہاتھ اور پاؤں، ان کو تم نے ''عوام کالانعام'' کہہ کر صدیوں سے چارپایوں کے درجہ پر رکھ چھوڑا ہے تم نے اپنی ایک محدود دنیا بنا رکھی ہے، اس دنیا میں تم شاداں و فرحاں ہو، اور کسی طبقے قوم اور فکر اور خیال کو خاطر میں نہیں لاتے، تمہیں ساون کے اندھے کی طرح خیر سے اپنے اہل قلم ''مجددین'' اور ''اصحابِ امر'' کے طفیل ہر طرف خزاں میں بھی ہَر یاوَل ہی ہَر یاوَل نظر آتی ہے، بہار کا عہد کبھی کا گزر چکا اور تم خوش اعتقادی میں اپنے ہاں اب تک بہار ہی کا عمل دخل دیکھ رہے ہو، دنیا میں زلزلے آ رہے ہیں، لیکن تم گھروں کے اندر آنکھیں بند کیے پڑے ہو، زندگی کی قہرمانی (طاقتور) قوتیں اپنی پوری شدت میں انسانیت کے بطن سے کوہ آتش فشاں کی طرح پھوٹ نکلی ہیں، ان کے ہاتھوں پرانی دنیا پر جو کچھ بھی گزرے کم ہے۔

جس آنے والے انقلاب کی میں تمہیں خبر دے رہا ہوں، میں یورپ کے ایک بڑے حصے میں اس انقلاب کو بروئے کار آتا دیکھ آیا ہوں، اس انقلاب نے اس سرزمین کی جس طرح کایا پلٹ کی اور غالب گروہ نے جس سفاکی سے اپنے حکمرانوں کو تہ تیغ کیا، میں اس کے اسباب اور نتائج خوب سمجھ چکا ہوں، لیکن یہ انقلاب بس اسی ملک تک محدود نہیں رہے گا، یہ عالم گیر انقلاب ہے اور یہ ساری انسانیت کو ایک نہ ایک دن اپنی لپیٹ میں لے کر

رہے گا، تم اس انقلاب کی قوت، وُسعت، شِدّت اور سفّا کی اپنی موجودہ زندگی میں محسوس تک نہیں کر سکتے، اس انقلاب کو قیامت سے کم نہ سمجھو، یقیناً یہ "حشر" برپا کر کے رہے گا۔ تاکہ انسانیت کے لیے خُدائے ذوالجلال کی طرف سے ایک نئے "نشر" کا سامان ہو سکے۔

ہوا یہ کہ انسانیت کی بڑی تعداد کو اب تک ایک گروہ نے دبائے رکھا، یہ مختصر گروہ کل قوت اور اقبال کا مالک تھا، انسانیت کی یہ بڑی تعداد کسان اور مزدو کماتے اور اوپر کا یہ مختصر گروہ ان کی کمائی کو اپنا حق سمجھتا، جو کماتے تھے ان کو کھانے کو نہ ملتا اور جو ان کی کمائی پر رہتے تھے، وہ کمانا ذلت کا نشان سمجھتے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ "کماؤ" طبقے پس ماندہ اور ذلیل ہو گئے، اور "کھاؤ" طبقے دولت اور اقتدار کے نشے میں انسانی اخلاق سے گر گئے اور مجموعی طور پر ساری انسانیت کو گھن لگا، غضب یہ ہوا کہ اس دور میں علم، کلچر اور مذہب کے جو معیار بنے، ان کے پیشِ نظر بھی بس اسی "مختصر گروہ" کی خوشنودی رہی۔ ان سے اگر سکون و اطمینان ملتا تو زیادہ تر ان لوگوں کو، اور ذہن کی، جلا ہوتی تو ان کی اور تہذیب و تمدّن کی برکتیں پھیلتیں تو صرف ان کے گھروں یا محلوں تک۔ کسانوں اور مزدوروں کو اتنی مشقت کرنی پڑتی کہ انہیں کسی بات کا ہوش بھی نہ رہتا۔ اور کبھی بھولے سے ان کے شعور کی آنکھیں کھل جاتیں تو انہیں سلانے کے لیے "خواب آور دواؤں" کی کمی نہ تھی، زمانہ مدتوں اسی طرح چلتا گیا، اور محنت کش طبقے نسلاً بعد نسلاً اپنے بھائیوں کے ہاتھ سے یہی دُکھ اٹھاتے رہے، لیکن ظلم کی بھی ایک حد ہوتی ہے، آخر اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش میں آئی اور اس سے اپنے بندوں کی یہ بُری حالت زیادہ دیر دیکھی نہ گئی۔ چنانچہ انسانی ذہن کو یہ توفیق عطاء ہوئی کہ وہ مشین ایجاد کرے، اس مشین سے صنعت و حرفت کا دور شروع ہوتا ہے، بیشک یہ دور بھی اپنے ساتھ بہت سی مصیبتیں لایا اور مشینوں کو چلانے والوں پر سالہا سال تک مشینوں کے مالکوں نے بڑے بڑے ستم توڑے، لیکن اب یہ مشینیں مزدوروں کے ہاتھوں میں ایک بے پناہ قوت کا ذریعہ بن گئی ہیں، آہستہ آہستہ یہ مزدو متحد اور منظم ہو رہے ہیں، اور آگے چل کر یہ ہوگا کہ زمین پر کام کرنے والے کسان بھی ان کے ساتھ مل جائیں گے۔

یہ انقلاب جسے میں اپنی آنکھوں سے برسرِ کار دیکھ آیا ہوں، انسانیت کے ان پسماندہ

www.rahimia.org

طبقوں کو للکار رہا ہے کہ اٹھو! غاصبوں سے اپنا حق چھینو! اور جو ظلم پر جی رہے ہیں، انہیں نیست و نابود کر دو! اس انقلاب کا نعرہ یہ ہے کہ: ''مزدو رواو رکسانو! محنت کشو! مستقبل تمہارا ہے؛ تم محنت کرتے ہو اور تمہاری محنت ہی کا نتیجہ یہ سربفلک عمارتیں، رزق کی یہ فراوانی، آرام و آرائش کے یہ ذرائع اور دُنیا کی یہ ساری ثروت اور دولت ہے، جس سے تم اب تک محروم رکھے گئے ہو اور جو تمہارا حق ہے اس پر قبضہ کر لو! اس میں جو شخص آڑے آئے اسے مٹا دو! جو علم، کلچر، مذہب اور اَخلاق تمہارے سد راہ ہو، اس کا انکار کر دو! وہ علم نا قابل اعتبار ہے۔ وہ کلچر بے کار اور فرسودہ ہے۔ مذہب غلط ہے۔ اور اخلاق کا وہ نظام بے معنی ہے۔

اس انقلاب نے اپنا ایک فلسفہ بھی وضع کیا، اس فلسفہ سے محنت کشوں کو ایک ایسا حربہ ہاتھ آ گیا ہے جس کا توڑ بڑے بڑوں سے بھی مشکل سے بن آتا ہے، اس فلسفہ کی نظری حیثیت جو کچھ بھی ہے، وہ تو ہے ہی، لیکن عملاً اس کا مقابلہ اس لئے بھی مشکل ہے کہ گو انقلاب کا یہ فلسفہ خُدا کے وُجود کا انکار کرتا ہے، لیکن اس کا دعوی اور کوشش یہ ہے کہ ساری کی ساری خَلقِ خُدا بغیر کسی رنگ، نسل، ملک یا مذہب کی تمیز کے آزادی، مساوات اور اقتصادی خوشحالی کی نعمتوں سے یکساں فیض یاب ہو، یہ فلسفہ مظلوموں کو انصاف کی امید دلاتا ہے، اس سے ذلیل اور پسماندہ انسان عزت و اقبال کے خواب دیکھنے لگتے ہیں، کم ہمتوں میں جرأت اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور اتفاق یہ ہے کہ آج اس زمانے میں ان مظلوموں، پسماندوں اور کم ہمتوں ہی کی کثرت ہے اور خُدا کی بیشتر مخلوق دکھوں اور روگوں ہی میں گرفتار ہے۔

لہٰذا اگر تم نے اپنے ملک کے تباہ حال اور بیکس طبقوں کی خبر نہ لی اور انہیں اس حال میں رہنے دیا، جس میں کہ وہ صدیوں سے جان توڑ رہے ہیں، اور تمہارے اوپر کے طبقے حسب سابق جونک بن کر ان کا خُون چوستے رہے اور ان کو تم نے اب بھی اس بھوک، جہالت، ذلت اور عفونت کی دلدلوں میں بدستور مرنے سڑنے دیا، تو یاد رکھو! کہ انقلاب کا یہ لادینی فلسفہ جو آگ کی طرح ساری دنیا میں پھیل رہا ہے! تمہارے ملک کے ان بدنصیب طبقوں کو دوسرے ملکوں کی طرح تمہارا جانی دشمن بنا دے گا اور اگر تمہاری غفلت

سے ان کی دُشمنی کی آگ بھڑک اُٹھی تو اس کے شُعلے تمہیں جلا کر خاک سیاہ کریں گے ہی، لیکن اس کے ساتھ تمہارے علم، کلچر اور مذہب کی بھی خیر نہ ہوگی۔

اس قسم کے انقلاب اور اس کے لادینی فلسفہ کے ہولناک نتائج سے بچنا چاہتے ہو تو انقلاب کے کسی ایسے دینی فلسفہ کو اختیار کرو! جس کے ذریعے تم خُدا کو مانتے ہوئے خُدا کی مظلوم مخلوق کو خوش حال بنا سکو! انسانیت اب زیادہ دیر تک ظلم نہیں سہ سکتی اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے اگر لادینی فلسفہ انقلاب کے علمبردار اپنے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ پسماندہ انسانیت کو نئی زندگی کی دعوت دیتے ہیں تو تم ساری انسانیت کو خُدا کی ایک سی مخلوق ماننے والے اور اسے ہر ذی روح کا رازق اور رب جاننے والے کوئی ایسا فکر کیوں پیش نہیں کرتے جس سے اس کی ساری مخلوق کی بھلائی ہو، ہر ظلم مٹ جائے، ہر حقدار کو اس کا حق ملے، ذلت و نکبت کا خاتمہ ہو اور کوئی بندہ اپنے رب کے دیئے ہوئے رزق سے محروم نہ کیا جا سکے، اور جس طرح ایک خاندان کے سب افراد آپس میں مل جل کر رہتے ہیں اسی طرح مجموعی انسانیت جس کی حیثیت فی الواقعہ ''عیال اللہ'' کی ہے۔ اللہ کی نعمتوں سے یکساں متمتع ہو۔

چنانچہ میں انقلاب کے اس قسم کے دینی فلسفہ کا پیغام لے کر آپ کے پاس آیا ہوں، انقلاب کا میرا یہ پیغام تمہیں لادینی انقلاب کے مضرت رساں اثرات سے محفوظ رکھ سکے گا، محنت کش طبقوں کے ہاتھ میں قوت اور اقتدار کا آنا یقینی ہے۔ تم نے اگر محنت کش طبقوں کے اس انقلاب کو دینی نہ بنایا تو پھر یہ انقلاب حتمی طور پر لادینی فلسفہ کے ذریعہ ہوگا۔''

www.rahimia.org

مقالہ نمبر (۶)

﴿جہاد: انقلاب﴾

ظلم اور استبداد کے خلاف نفرت کا جذبہ مجھ میں بچپن سے موجود تھا، میں مسلمان ہوا تو شاہ ولی اللہؒ کی حکیمانہ تعلیمات نے میرے اس جذبے کو ایک ایجابی رنگ دیا اور اس میں وسعت و گہرائی پیدا کی، ان بزرگوں کے فیض سے ہی مجھ پر یہ حقیقت روشن ہوئی کہ قرآن کا مقصد عالمگیر انقلاب برپا کرنا تھا، اور آج بھی قرآن کے ماننے والوں کا فرض ہے کہ وہ اپنا نصب العین عالمگیر انقلاب کو بنائیں، میں اپنے ان عالی مرتبت مرشدوں کا بے حد احسان مند ہوں کہ انہوں نے میرے جذبۂ نفرت کو جو ابتداء میں محض ایک ذاتی اور منفی حیثیت رکھتا تھا ایک عالمگیر اور ہمہ گیر ایجابی نظریۂ زندگی بنا دیا۔ چنانچہ قرآن کا یہی عالمگیر اور ہمہ گیر نظریہ اب میرا نصب العین ہے۔ اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جدوجہد کرنا میرا مسلک ہے۔

میرے نزدیک انقلاب کا جذبہ ہی فرد کی خودی کو بیدار کرتا ہے، اور جب انسان کی خودی بیدار ہو جائے تو وہ بلا خوف و خطر زندگی کی کشمکشوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے وہ فرسودہ اور بے کار دستوروں کو توڑ پھوڑ دیتا ہے اور زندگی کی نئی طرح (بُنیاد) ڈالتا ہے یعنی عمل کا مظہر اتم ذوق انقلاب ہے اور یہی "ذوق انقلاب" فکر اور عمل میں تعمیر و تخلیق کا باعث بنتا ہے اسی ذوق انقلاب نے روسی اشتراکیوں میں اتنی ہمت اور جرات پیدا کر دی تھی کہ انہوں نے زار کی زبردست حکومت کے پرخچے اڑا دیئے۔ روس میں ایسا نظام قائم کیا جس کی ساری دنیا مخالف تھی، لیکن انقلاب کا ولولہ رکھنے والوں نے کسی کی پرواہ نہ کی اور اپنے عزم و یقین پر برابر ثابت قدم رہے۔

جہاد اور انقلاب کے ضمن میں یہاں ایک بات واضح ہو جانی چاہیے جہاد کو عام طور پر تیغ آزمائی اور کشور کشائی ہی سمجھا جاتا ہے اور انقلاب کے معنی ہم توڑنا پھوڑنا، قتل و غارت

www.rahimia.org

اور تخریب ہی کے لیتے ہیں، لیکن نہ جہاد صرف تیغ آزمائی ہے اور نہ انقلاب محض تخریب کا دوسرا نام ہے۔ حدیث وقرآن میں جہاد بڑے وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ جہاد بالسیف کا وجود ہی نہیں۔ جہاد تلوار سے بھی ہوتا ہے اور قلم سے بھی، زبان سے بھی، دل سے بھی اور اکثر تو خود اپنے نفس سے ہی جہاد کرنا پڑتا ہے۔

اسی طرح انقلاب محض تخریب نہیں۔ منفی خیالات پیش کرنا انقلابی کا کام نہیں ہوتا، بلکہ وہ فرسودہ نظام حیات کی جگہ ایک نیا بہتر اور جاندار نظام پیش کرتا ہے۔ ہم نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ انقلاب ماضی کی ہر چیز کو مٹا دینے کا نام ہے۔ اس لیے انقلاب اچھا نہیں، اس سے تجدد وارتقاء بہتر ہے، یہ انقلاب کی اصلی حقیقت کو نہ سمجھنے کی دلیل ہے۔ انقلاب اصولاً صرف ان چیزوں کو مٹاتا ہے جو مٹانے کے قابل ہوتی ہیں، وہ ماضی کا انکار نہیں کرتا، بلکہ وہ انسانی تاریخ کے ان سارے ''باقیات صالحات'' کو برقرار رکھتا ہے جن کا برقرار رکھنا ضروری ہوتا ہے اور نئے نظام کی تعمیر میں ان سے پورا کام لیتا ہے، زندگی کے دھارے کو اگر بہتا رہنے دیا جائے تو برابر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، لیکن جب کسی وجہ سے اس کا راستہ رک جائے اور پانی چڑھتا چلا جائے تو پھر یکبارگی بند ٹوٹتا ہے اور ہم کہتے ہیں کہ سیلاب آ گیا۔ تجدد وارتقاء کے ذریعے سے جو منزلیں برسوں میں طے ہوتی ہے، انقلاب لانے والے اپنے آپ کو دوسروں سے بہت پیچھے پا کر بیک خروش ان تک پہنچنا چاہتے ہیں یا ان سے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔

بے شک اس دور کا سب سے بڑا انقلاب مادی اور صنعتی انقلاب ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ انقلاب ہمیشہ مادی اور صنعتی ہو، بلکہ اب تو اس کا زیادہ امکان ہے کہ آئندہ انقلاب انسان کی نفسی اور ذہنی زندگی میں ہو۔ بعض محقق اہل قلم لکھتے ہیں:

> ''انسانیت کے ارتقاء کی اگلی منزل طبعی نہیں بلکہ نفسی اور ذہنی ہو گی، پہلے پہلے انسان ارتقاء کی منزلیں طے کر کے حیوانیت سے انسانیت کے مقام پر آیا، پھر اس نے صنعت وحرفت کی مدد سے اپنے آپ کو آلات واسباب سے آراستہ کیا، ہمارے اس دور میں انسان نے صنعت وحرفت میں پورا کمال حاصل کر لیا ہے، اب اس کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اس منزل سے آگے بڑھے اور جس طبعی ارتقاء نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ

وہ حیوان سے ترقی کر کے انسان کے درجے میں قدم رکھے، پھر اسکی جبلی ضرورتوں نے اس سے اوزار و آلات بنوائے، اور انسان مشین اور سٹیم کا خالق بنا اسی طرح آج وہ مجبور ہے کہ اپنا قدم آگے بڑھائے، اس کا یہ قدم مادی نہیں بلکہ نفسی اور ذہنی ترقی کی طرف ہو گا"۔(1)

میری نظر میں یورپ کا یہ مادی انقلاب بھی آگے چل کر لامحالہ انسانوں کی نفسی اور ذہنی ترقی کا محرک ہوگا، اور یورپ کے وہ طبقے جو اب تک صرف مادے کو ہی مقصد حیات اور حاصل حیات سمجھتے ہیں، زندگی کو ماورائے مادہ بھی ماننے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بیشک میں موجودہ مادی انقلاب کا دل و جان سے معترف ہوں، اور میرا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم یورپ کی دو سو سال کی جدوجہد اور سائنس نے دنیائے اسباب کی تسخیر میں جو معجزات دکھائے ہیں ان کا انکار کریں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ترقی کی اس منزل سے بہت پیچھے چلے جائیں گے۔

میں چاہتا ہوں کہ یورپ کی اس مادی ترقی کو تسلیم کر لیا جائے، یعنی علم اور سائنس کی ترقیوں کو ہم زندگی کی بُنیاد کی حیثیت دیں، لیکن یہ نہ سمجھیں کہ سائنس نے ساری زندگی کا احاطہ کر لیا ہے۔ بے شک سائنس نے مادی دنیا میں جو انکشافات کیے ہیں وہ سب صحیح ہیں، لیکن زندگی صرف مادے تک ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ یہ مادہ کسی اور وُجود کا پرتو ہے اور اس وُجود کا مرکز ایک اور ذات ہے جو خود زندگی ہے اور زندگی کا سہارا اور باعث بھی، وہی ذات "اَلْحَيُّ الْقَيُّوْم" ہے۔ میں مادیّین (MATERIALISTS) کے تصور کائنات کو سرے سے غلط نہیں مانتا، لیکن اسے ناقص ضرور سمجھتا ہوں مادی فکر کا منکر نہیں ہوں، لیکن یہ جانتا ہوں کہ مادیت حقیقت کا صرف ایک رُخ ہے اور یہ رُخ بے شک حقیقت کے ایک پہلو کا صحیح ترجمان ہے، لیکن حقیقت کا ایک اور پہلو بھی ہے جو مادے سے ماورا اور بالاتر ہے، اس کو شرعی زبان میں "غیب" کہا گیا ہے، زندگی کا مادی تصور حیات اس لحاظ سے ناقص ہے کہ وہ زندگی کے صرف ایک پہلو کی رونمائی کرتا ہے لیکن زندگی کا صحیح اور مکمل تصور رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۲۰۱:۲) ہے، یہی تصور ہے جو زندگی کی ساری مادی اور مارائے مادی کائنات پر حاوی ہو سکتا ہے۔

چنانچہ میں برصغیر میں یورپ کی قسم کا مادی انقلاب چاہتا ہوں، لیکن اس سے میرا مقصود علم اور سائنس کی تمام برکات کو جس سے آج کل یورپ مستفید ہو رہا ہے اپنے ملک میں رائج کرنا ہے، تاہم میری نظر صرف اس مادی انقلاب تک محدود نہیں۔ میرے پیش نظر تو ہر فرد انسانی کا تعلق کائنات کی روح کل سے جوڑنا ہے اور اسی کو میں اسلام سمجھتا ہوں۔ لیکن میرے نزدیک جب تک مادی دنیا پر انسان قابو نہ پا لے، اور علم و سائنس کی برکتیں ہر شخص کے لیے عام نہ ہو جائیں، انسانیت بحیثیت مجموعی اسلام کے قریب نہیں آ سکتی۔ اسلام کی حکومت خُدا کی حکومت ہے اور حکومت کے معنی یہ کہ اس کی نعمتیں اس کے سارے بندوں کے لیے عام ہو جائیں۔ اسی بناء پر میں اپنے اسلام کو یورپ کی مادی ترقی کا مخالف نہیں، بلکہ اس کا تتمہ اور تکمیل کرنے والا جانتا ہوں اور جب تک ہم یورپ کے مادی انقلاب کو اپنا نہ لیں گے، اسلام کا عالمگیر انقلاب شرمندہ معنی نہ ہو سکے گا۔

www.rahimia.org

حوالہ نمبر:

(1)

مقالہ نمبر (۷)

﴿قرآن کا اعجاز﴾

قرآنِ عظیم کے سلسلے میں امام شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

''اس فقیر پر بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ مجھے متعدد بار اپنے والد بزرگوارؒ کے درسِ قرآن میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا، آپ قرآن کے معانی بڑے غور و تدبر کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔ آیات کی شانِ نزول کی وضاحت کرتے اور حل طلب امور کے لیے تفسیروں کی طرف رجوع کیا جاتا، اس کی جہ سے میرے سامنے فتح و کامیابی کا ایک میدان کھل گیا، والد بزرگوارؒ کا دستور یہ تھا کہ اپنے رفقاء کے حلقے میں ہر روز تین رکوع سے کم مقدار میں قرآن کی تلاوت کرتے اور اس کے معانی پر غور و خوض فرماتے''۔(1)

خود شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حج سے واپس آکر پانچ سال کے بعد قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کے بعد پہلی بار اس کی تعلیم شروع کی۔ شاہ صاحبؒ نے دیکھا کہ ان کے زمانے کی اعلیٰ سوسائٹی حکمتِ عملی کو سمجھتی اور پہچانتی ہے۔ چنانچہ آپؒ نے اسی حکمتِ عملی کو قرآن کے تعارف کا ذریعہ بنایا، اور اس عہد میں جو مروّجہ اور متداول (عالمگیر) حکمتِ عملی تھی اسے قرآن کے عملی تصورات کے تابع کیا، اُس طرح قرآن کی حکمتِ عملی کا اساسی فکر مسلمانوں کے سامنے پیش فرمایا۔ شاہ صاحبؒ بارہ برس تک اپنے گرد و پیش کی سوسائٹی کا مطالعہ کرتے رہے اور اپنے اس بارہ برس کے مطالعہ میں اپنے پروگرام کے دو اُصول متعین کیے:

۱۔ قرآنِ عظیم کی حکمتِ عملی: یعنی انسانوں کی عملی زندگی کے متعلق قرآنی تصورات ہی حقیقت میں ایک معجزے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اساس علمی اصلاح کے لیے تجویز ہوئی۔

۲۔ اقتصادی عدمِ توازن: معاشرت، اجتماع، حکومت اور ملت میں تمام اخلاقی اور

www.rahimia.org

عملی خرابیوں کا باعث دراصل معاشی اور اقتصادی عدم توازن ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن عظیم کا معجزہ ہونا تو سب مسلمانوں کے لیے مسلم ہے، لیکن ہر گروہ کا اعجاز قرآن کے متعلق اپنا اپنا نظریہ ہے، فلسفی مزاج علمائے اسلام نے بہت پہلے اس اعجاز قرآن کو جو صرف عربی بلاغت سے وابستہ ہے، چنداں اہمیت نہیں دی، اس پر اُن کے مخالفین کی طرف سے بہت کچھ لے دے بھی ہوئی۔ لیکن اگر ان فلسفی مزاج لوگوں کے اقوال کی یہ توجیہہ کی جائے کہ عجمی اقوام چونکہ عربی بلاغت کے اعجاز کو کماحقہٗ سمجھنے سے قاصر تھیں۔ اس لیے ان کے لیے ان کے لیے قرآن کے اعجاز کا معیار عربی بلاغت نہیں ہو سکتا تھا اور یہ لوگ مجبور تھے کہ اعجاز کا معیار کسی دوسری چیز میں ڈھونڈیں تو سارا مسئلہ آسان ہو جاتا ہے۔

لہٰذا شاہ صاحبؒ نے قرآن کے اعجاز کو اس کے بتائے ہوئے نظام حیات میں متعین فرمایا اور اس طرح قرآن کی عملی افادیت ہی ان کے نزدیک اس کا معجزہ ہونا ثابت ہوئی، اب قرآن کے اس نظام حیات سے ہر شخص خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، عامی ہو یا عالم، فلسفی ہو یا سادہ مزاج، مستفید ہو سکتا ہے اور اس کے اعجاز کو سمجھ سکتا ہے، لیکن اگر قرآن کا اعجاز محض عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کا پابند ہو جاتا ہے تو اس صورت میں معدودے چند افراد کے سوا دوسرے لوگ اس کی اعجازی خوبیوں سے محروم رہتے۔

قرآن کی حکمت عملی کے علاوہ شاہ صاحبؒ کے انقلابی پروگرام کا دوسرا اصول، اقتصادیات میں توازن اور مساوات کی اہمیت واضح کرنا تھا۔ عام طور پر تصوّف فلسفۂ اخلاق سے شروع ہوتا ہے، گو حیوانی زندگی کے لیے اقتصادی ضروریات کا اعتراف کیا جاتا ہے، لیکن انسانیت کے ساتھ اقتصادیات کا جو تعلق ہے اس پر کسی نے توجہ نہ کی، اس کی وجہ سے ہماری سیاست کھوکھلی ہو گئی، ہمارے بڑے بڑے عقل مند اور زیادہ با اخلاق صوفیاء سب کے سب اجتماعی سیاست سے دور رہنا اپنا کمال سمجھتے رہے، تصوّف کی عام کتابوں کی سب سے بڑی کوتاہی یہی تھی کہ ان کے مدون کرنے والوں نے انسانی اخلاق اور اقتصادیات کے باہمی رشتے اور ان کے ایک دوسرے سے متاثر ہونے کی اہمیت کو نہ سمجھا۔ اس کے برعکس شاہ صاحبؒ نے زندگی کی اس حقیقت کو اس کی صحیح شکل میں پہچانا

www.rahimia.org

اور بار بار اپنی کتابوں میں اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

"اگر کسی قوم میں تمدّن کی مسلسل ترقی جاری رہے تو اس کی صنعت وحرفت اعلیٰ کمال پر پہنچ جاتی ہے،اس کے بعد اگر حکمران جماعت آرام وآسائش اور زینت وتفاخر کی زندگی کو اپنا شعار بنالے تو اس کا بوجھ قوم کے کاریگر طبقات پر اتنا بڑھ جاتا ہے کہ سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہو جاتے ہیں جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے۔ اس وقت وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح روٹی کمانے کے لئے کام کریں گے۔ جب انسانیت پر ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے تو خُدا تعالیٰ انسانیت کو اس سے نجات دلانے کے لیے کوئی راستہ ضرور الہام کرتا ہے،یعنی ضروری ہے کہ قُدرتِ الٰہیہ انقلاب کا سامان پیدا کر کے قوم کے سَر سے ناجائز حکومت کا بوجھ اُتار دے۔ چنانچہ کسریٰ وقیصر کی حکومت نے بھی یہ وطیرہ (تعیشات اور آرام وآسائش) اختیار کر رکھا تھا،لہٰذا اس مرض کے ازالے کے لیے اُمیّین (عربوں) میں رسول ﷺ کو پیدا کیا گیا،فرعون کی ہلاکت اور قیصر وکسریٰ کی تباہی اس اُصول پر لوازمِ نُبوت سے شمار ہوتی ہے"۔(2)

شاہ صاحبؒ کے نزدیک انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے اقتصادی توازُن ایک ضروری امر ہے اور ہر انسانی جماعت کو ایسے اقتصادی نظام کی ضرورت ہے جو اس کی ضروریات زندگی کا کفیل ہو جب لوگوں کو اپنی اقتصادی ضرورتوں سے اطمینان نصیب ہوتا ہے تو پھر کہیں وہ اپنے خالی وقت میں جو ان کے پاس کسبِ معاش کے بعد بچ رہتا ہے۔ زندگی کے ان شعبوں کی ترقی اور تہذیب کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں، جو انسانیت کا اصل جوہر ہیں،لیکن اگر ان کی اقتصادی ضروریات ہی فراہم نہ ہوں اور ان کی وجہ سے حیوانی زندگی ٹھٹھر کر رہ جائے تو انسانیت کے اعلیٰ مقامات کا کسے ہوش رہے گا۔ اقتصادی نظام کے درست اور متوازِن ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس زندگی میں انسانی اجتماع کے اخلاق تکمیل پذیر ہو سکتے ہیں۔

جب انسان کے اخلاق اس دنیا میں سُدھر گئے اور تہذیبِ نفس کے ذریعے اس نے

اپنے اخلاق کی تکمیل کر لی تو لازمی طور پر موت کے بعد دوسری زندگی میں اس کے لیے قبر و حشر کی مُصیبتیں آسان ہو جائیں گی، اخلاق کی یہ تکمیل ہی اُسے جنت کا حقدار بنائے گی اور اس کی آخری ارتقائی منزل یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے دیدار سے بہرہ ور ہو۔ اگر انسانی اجتماع کو ترقی کی اس راہ پر چلانا نبوت کا اصل مقصد سمجھ لیا جائے تو نبوت انسانی زندگی کے لیے ایک فطری چیز بن جاتی ہے، نیز جہاں نبوت نہ ہو وہاں انبیاء کے پیروکار یعنی صدیق اور حکیم یہ کام کریں تو اس طرح انسانیت کا مجموعی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک اقتصادی توازُن کے یہی معنی ہیں۔ قرآنی حکمت عملی اور اقتصادی توازن، یہ دو اُصول تھے شاہ صاحبؒ کے مجوزہ انقلابی پروگرام کے، اور مختصر الفاظ میں اُوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، ان دو اصولوں سے یہی مراد تھی۔

شاہ صاحبؒ اپنے اس لائحہ عمل کو ایک مدلل شکل میں اپنی قوم کے اربابِ فکر کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے، اور اس کے لیے جس قدر علم حدیث کی ضرورت تھی اس کی تحصیل دہلی میں ممکن نہ تھی، اس لئے آپ حجاز شریف لے گئے۔ وہاں دو سال کے عرصے میں آپؒ نے حدیث وفقہ میں مجتہدانہ کمال پیدا کر لیا۔

شاہ صاحبؒ نے (جمعہ کی رات ۲۱ ذی قعدہ ۱۱۴۴ھ بمطابق 1730ء) مکہ معظمہ میں ایک الہامی خواب دیکھا، اس کا حال ہم اپنی زبان میں تحریر کرتے ہیں۔(3)

۱:۔ انہیں یقین دلایا گیا کہ ان کے ذریعے موجودہ مفاسد کا تدارُک ہوگا، یعنی وہ ان خرابیوں کو دُور کرنے میں ایک مستقل ذمہ دار حیثیت کے مالک ہوں گے۔

۲:۔ انہیں بتایا گیا کہ پہلا نظام توڑ کر اس جگہ وہ نیا نظام قائم کرنے کا ذریعہ بنیں گے، یعنی وہ ہندوستانی مسلمانوں کے تمام دینی علوم اور سیاسی و اجتماعی تحریکات میں مستقل امام ہوں گے۔

۳:۔ اُنہیں سمجھایا گیا کہ ان کی اصلاحات نافذ کرنے کے لیے باہمی لڑائیوں کا ایک طویل سلسلہ پیش آنے والا ہے۔

مختصراً اس سارے خواب کا حاصل یہ نکلا کہ شاہ صاحبؒ اسلامی ہندوستان میں ایک مکمل اجتماعی انقلاب کے شروع کرنے والے ہوں گے، اس عزم کے ساتھ شاہ صاحبؒ

دہلی واپس آئے۔ سب سے پہلے آپؒ نے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ''فتح الرحمٰن'' مکمل کیا جس میں اجمالی طور پر اپنے پروگرام کو درج کر دیا اور (۱۱۵۶ھ/ 1743ء) میں اس کی تدریس بھی شروع کر دی۔ شاہ صاحبؒ نے ''فتح الرحمٰن'' کے حواشی مین وہ تمام چیزیں درج کر دی ہیں، (4) جو ان کی دعوتِ تجدید میں اساس کا حکم رکھتی ہیں۔ سب سے پہلی بات جس کی طرف شاہ صاحبؒ نے توجہ دلائی کہ اسلام کی حکومت (خلافتِ باطنہ/تنظیم کی داخلی حکمرانی کا نظام) مکہ ہی میں وجود میں آ گئی تھی، اور یہ اپنی جگہ مستقل حکومت تھی، گو اس زمانے میں ابھی تشدّد اور لڑائی کی اجازت نہ ملی تھی۔

شاہ صاحبؒ نے اسی نظامِ مکی کی تقلید میں اپنی انقلابی تحریک کو چلایا، انہوں نے تصوّف کے خاص طریقے کی بیعت کو اپنے سیاسی نظام کی اساس بنایا۔ دوسرے لفظوں میں طریقت کی بیعت کا یہ مطلب ہوتا تھا کہ بیعت کرنے والے نے جماعت کا سیاسی نظام تسلیم کر لیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی سیاست میں تصوّف کو اتنا بلند دینی درجہ دیا گیا۔ بات یہ ہے کہ جب تک حکومت چلانے کی استعداد پیدا نہ ہو، کوئی شخص لڑ کر نیا نظام حکومت قائم نہیں کر سکتا۔ بے شک وہ لڑائی کے ذریعے پچھلی حکومت کو تباہ تو کر سکتا ہے، لیکن جب تک تربیت یافتہ آدمی اسے میسر نہ آئیں، وہ نئی حکومت چلا نہیں سکتا اور اس قسم کی تربیت اور استعداد صرف عدمِ تشدد کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ہر نئی تحریک کو شروع میں اپنا پیغام دوسروں کو سُنانے اور ان کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے عدمِ تشدّد پر لامحالہ عمل کرنا پڑتا ہے، شاہ صاحبؒ نے اسی اُصول پر اپنی جماعت تیار کرنا شروع کی، چنانچہ وہ اس میں کامیاب ہوئے ان کے بعد ان کے جانشین شاہ عبدالعزیزؒ نے نظامِ حکومت چلانے کے لیے آدمی بھی تیار کر دیئے۔

بے شک اس زمانے میں ایسے باخبر لوگ موجود تھے، جنہیں اس انقلابی تحریک کا احساس ہوا۔ انہوں نے عوام میں شورش پھیلا کر مسجد فتح پوری سے نکلتے وقت حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ پر حملہ کرا دیا۔ امام ولی اللہؒ نے اپنے اس فکر کی اشاعت اور تعلیم کی غرض سے بیسیوں کتابیں لکھیں جو کہ سب دہلی کی علمی زبان ''عربی'' اور عام پڑھے لکھے لوگوں کی زبان یعنی ''فارسی'' میں تھیں، ان کتابوں میں شاہ صاحبؒ نے اپنی دعوت کے اُصول

اور مسائل ضبط کر دیئے، لیکن اس معاملے میں اتنا التزام فرمایا کہ ان امور کو ایک جگہ قلمبند نہ کیا، بلکہ ان کو اپنی تصانیف میں اِدھر اُدھر پھیلا کر بیان کر دیا، اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ نااہل لوگوں کی دست بُرد سے محفوظ رہیں۔

شاہ صاحبؒ کے پروگرام کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ امام ولی اللہ کی حیثیت امت محمدیہؐ میں ایک عظیم الشان صدیق اور حکیم کی ہے۔ اس طرزِ فکر کے اربابِ کمال، انبیاء علیہم السلام کی طرح تمام انسانیت کو اپنا مخاطب بناتے ہیں۔ گو بظاہر ان کی دعوت اپنی قوم کے لئے ہوتی ہے۔ امام ولی اللہؒ کی کتابیں غور سے پڑھی جائیں تو صاف نظر آئے گا کہ ان کی زبان اگرچہ دہلی کی زبان ہے، لیکن ان کے مخاطب دہلی کے اعلیٰ طبقے کے توسّط سے ایک طرف یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کی عربی و عجمی قومیں ہیں، تو دوسری طرف یونان، ایران اور ہند کی صابئ (آرین) قومیں بھی مساوی درجے پر خطاب میں شریک ہیں، واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا رُوئے سخن دراصل تمام انسانیت کی طرف تھا، چنانچہ اپنی کتاب "البدور البازغہ" میں ارتفاقات (اجتماعی اداروں) کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"ہم نے یہاں ان اِرتفاقات (اجتماعی اداروں) کے احکام اور ان سے متعلقہ علوم کے بیان میں بڑی تفصیل سے کام لیا ہے، لیکن اس معاملے میں دو باتیں ضرور پیش نظر رہنی چاہئیں:

(۱) ایک تو یہ کہ ہم ارتفاقات کی وضاحت کے سلسلے میں عموماً ایک معین مثال کا ذکر کرتے ہیں، لیکن اس سے ہمارا مقصد صرف یہی نہیں ہوتا بلکہ یہ یا اس جیسی کوئی اور یا اس کے لگ بھگ کوئی دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے۔ ہمارا اصل مقصود تو یہ ہے کہ وہ عمومی قواعد جن کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، ان پر اجتماعی ادارے پورے اتریں۔ ظاہر ہے یہ ادارے ہر قوم اور ہر ملک میں ایک سے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ہر قوم کی اپنی خاص عادتیں اور اپنے مخصوص علوم ہوتے ہیں۔ البتہ ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ یہ ادارے عمومی قواعد (بنیادی اصول) کے مطابق ہوں۔ خواہ ظاہری شکل و صورت میں یہ ایک دوسرے سے جدا جدا ہی ہوں۔

(۲) دوسری یہ بات ہے کہ انسان خود اپنی جبلت اور طبیعت کے تقاضے سے مجبور

ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے ارتفاق (اجتماعی ادارے) کی تشکیل کرے، یہ پہلا درجہ ہے دوسرے درجے میں تجربی علوم اور صحیح اخلاق ظہور پذیر ہوتے ہیں"۔(5)

اس سے زیادہ تفصیل "البدور البازغہ" میں تیسرے مقالہ کے شروع میں ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"تمہیں جاننا چاہئے کہ وہ تمام ارتفاقات (اجتماعی ادارے) جن پر انسانی نظام تمدّن کی عمارت کھڑی ہے اور کُل کے کُل اقترابات (خُدا تک پہنچنے کے وسائل) جو انسانوں کی فطرت میں ودیعت کئے گئے ہیں مثلاً احسان، عبادت اور بُرائیوں سے اجتناب وغیرہ وغیرہ یہ ایسے امور ہیں جو مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے قواعد کلیئے یعنی بُنیادی اُصول تو ایک ہیں لیکن ان کی صورتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ ان میں سے ہم مثال کے طور پر نکاح کو لیتے ہیں، جس نے نکاح کے معاملے میں اعلان ڈھول بجانے اور غنا (گانا) پر اکتفا کیا (جیسا کہ ہندو تمدّن میں ہے) تو اس نے حقّ واجب ادا کر دیا اور اسی طرح جس نے نکاح کے لئے گواہ اور ایجاب وقبول کو ضروری ٹھہرایا، اس نے بھی نکاح کا فرض پورا کر دیا، کیونکہ نکاح کا اصل مقصود تو یہ ہے کہ ایک عورت کا اس طرح تعیّن کر دیا جائے کہ اس میں ایک مرد کے سوا کوئی دوسرا دخیل نہ ہو سکے اور اُوپر کی ہر دو صورتوں میں حاصل مُراد یہی ہے۔

یہی حال تقرّب الی اللہ کا ہے کبھی تو اس منزل تک انسان یُوں پہنچتا ہے کہ وہ انسانی خواص کا جامہ اُتار کر خُدا کی ذات میں اپنے آپ کو گُم کر دے۔ اور تقرّب الی اللہ کا دوسرا راستہ یہ ہے کہ اپنے اعضاء و جوارح کی صحیح تربیت کی جائے اور انسانی خواص کے دائرے میں رہتے ہوئے اللہ سے تقرّب چاہا جائے۔ اسی پر ان تمام بڑے بڑے مسائل کا قیاس کرلو! جو ارتفاقات اور اقترابات کے سلسلے میں ہم نے بیان کئے ہیں، اور بتایا ہے کہ ان کی شکلیں اور صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔

اس سے پہلے ملت حنفی کے نقطۂ نظر سے ہم ارتفاقات اور اقترابات کی بہت سی شکلیں پیش کر آئے ہیں، تم کہیں ان کی وجہ سے غلطی میں نہ پڑ جانا، ان کا ذکر محض مثال کے طور پر تھا، اس سے زیادہ اس ذکر سے ہمارا کوئی اور مقصد نہ تھا اور پھر یہ بھی نہ سمجھ لینا کہ اصل حقیقت صرف ارتفاقات اور اقترابات کی ان بیان کردہ شکلوں تک محدود ہے، بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جہاں تک اس معاملے میں اصل حقیقت کا تعلق ہے، کوئی ملت یا مذہبی گروہ ایسا نہیں جو اصل حقیقت کا اعتراف نہ کرے، ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ اس

کے احکام کو بجا نہ لائے، جھگڑا اصل حقیقت کے معاملے میں نہیں ہوتا، نزاع اور اختلافات اس حقیقت کو مختلف شکلوں میں پیش کرنے پر پیدا ہوتے ہیں۔" (6)

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ امام ولی اللہؒ کی تصانیف میں جس قدر قواعد کلیہ مذکور ہیں وہ دراصل اُن کے فلسفے کے بُنیادی اُصول ہیں اور انسانیت عامہ کو اسی کی دعوت دی گئی ہے اور اس ضمن میں جس قدر مسائل بیان کیے گئے ہیں وہ ان قواعد کی مثالیں ہیں، ان عمومی قواعد کو ان مخصوص مثالوں میں مُنحصر نہیں سمجھنا چاہیے، انسانیت کی اس اساسِ فکر پر جس کی دعوت شاہ صاحبؒ دیتے ہیں، دین دار اقوام کے عقل مند افراد ایک بین الاقوامی نقطۂ وحدت پر جمع ہو سکتے ہیں اور قرآن عظیم کے خصوصی قانون نے اسی بین الاقوامی سپرٹ (جذبہ) کو صحیح اُصول پر محفوظ کر دیا ہے۔

حوالہ جات:

(1) انفاس العارفین (فارسی)، ص ۸۵۔

(2) حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۲۲۱ (باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم) طبع بیروت

(3) دیکھئے "فیوض الحرمین" عربی اردو ص ۲۶۶، مطبوعہ محمد سعید اینڈ کمپنی، کراچی۔

(4) مثلاً سورۃ الرعد کی آیت: اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُہَا مِنۡ اَطۡرَافِہَا ؕ کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔

(5) البدور البازغہ، المقالۃ الاولیٰ، ص ۱۲۵، مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدر آباد

(6) البدور البازغہ، فصل فی بیان تحقیق الملۃ، المقالۃ الثانیہ، ص ۲۴۰۔

www.rahnia.org

مقالہ نمبر(۸)

﴿تاثیرقرآن﴾

ہمارے اہل علم حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصانیف اگر غور سے پڑھیں تو ان پر شاہ صاحبؒ کے مخصوص نظریات واضح ہو جائیں گے۔شاہ صاحبؒ کے وہ افکار جو پہلی ہی نظر میں ان کی تصانیف میں سے آشکار ہو جاتے ہیں،ہم ان میں سے نمونے کے طور پر پانچ کا یہاں ذکر کرتے ہیں۔

(۱)

قرآن عظیم ایک انقلاب آفریں نظام کی دعوت دیتا ہے،یہ انقلاب آفریں نظام بین الاقوامی ہے اور ساری انسانیت پر محیط ہے،رہتی دنیا تک جب بھی مسلمانوں کی کوئی جماعت اس پر عمل کرے گی تو اس سے وہی نتائج پیدا ہوں گے جو تاریخ اسلام کے دور اول میں دنیا نے دیکھے۔یہ قرآن کی تاثیر ہے،محض کسی آدمی یا زمانے کی تخصیص صحیح نہیں۔

مسیحی دنیا قرآن کی اس تاثیر کو عام نظروں سے اوجھل کرنے کے لیے برابر کوشاں رہتی ہے،مشہور عیسائی مورخ اور مصنف "جُرجی زیدان" نے تو صاف لکھ دیا ہے کہ "حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت کا نظام محض بخت و اتفاق کا نتیجہ تھا" یعنی عہد گزشتہ میں اسلام کے عظیم الشان انقلاب کا باعث قرآن کی تعلیمات نہ تھیں،بلکہ اتفاق سے چند افراد ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے ایک بار ایسا کر دکھایا،لیکن یہ کہ ہمیشہ یوں ہو، غلط ہے۔اس کے علاوہ قرآن کے دُوررَس اِنقلابی اثرات کو زائل کرنے کے لئے اور بھی حربے استعمال کئے جاتے ہیں۔

زمانہ حال میں مروجہ مجالس ہائے سیرت کا نظام،اسی قسم کا ایک خواب آور نشہ ہے جو مسلم عوام کو پلایا جارہا ہے۔تحریک چلانے والے یہ سمجھیں یا نہ سمجھیں،مگر جن لوگوں نے ان کو یہ لُقمہ دیا ہے،ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے دماغوں میں یہ خیال جما لیں

کہ اسلام کی تمام اثر آفرینی قرآن کی بجائے صرف اور صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے نظیر شخصیت میں مُضمر ہے، اگر آئندہ بھی کوئی ایسی شخصیت بروئے کار آ گئی تو ممکن ہے یہ اثر دوبارہ پیدا ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت انتظارِ مہدی میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے۔

(۲)

قرآن کی تعلیمات کے اثر سے مسلمانوں میں جو اجتماعی تحریک عالم وجود میں آئی وہ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے شروع ہو کر حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت تک مُنزَّہ اور اپنی اصلی حالت میں جاری رہی، قرآن حکیم کی عملی تفسیر کے طور پر اس اِجتماعی تحریک کو جاننا ضروری ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے، اسی شہر میں اسلام کی اجتماعی تحریک نے ایک مستقل نظام کی شکل اختیار کی، آپؐ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور میں مدینہ ہی اسلام کی تحریک کا مرکز اور مصدر بنا رہا۔ بعد میں جب مسلمانوں میں خانہ جنگیاں شروع ہوئیں اور حضرت علیؓ نے مدینہ کی بجائے کوفے کو اپنا سیاسی مرکز بنایا، ان کے بعد اُمویوں نے دمشق میں اپنا دارُالخلافت منتقل کر لیا تو پھر بھی اسلام کی دینی اور فکری مرکزیت مدینہ ہی میں رہی۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن کے اثر و تاثیر سے جو نظامِ اجتماعی معرضِ وُجود میں آیا اس کے اساس و مبادی اور تعلیمات، اہل مدینہ کے ہاں محفوظ رہیں؛ بعد میں ان کو امام مالکؒ نے اپنی کتاب ''مؤطا'' میں مُدوّن کر دیا۔

(۳)

قرآن حکیم نے اس آیت:

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

ترجمہ: ”اللہ وہ ذات ہے، جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اسے تمام ادیان پر غالب کرے، اگرچہ مشرکین اسے ناپسند کریں“۔(۹:۶۱)

میں تمام ادیان پر جس غلبے کا دعویٰ کیا ہے وہ خلافت راشدہ کے اس دورِ اول میں پورا ہو چکا ہے۔ یہ خیال کہ قرآن کا یہ دعویٰ ہنوز تشنۂ تکمیل ہے، صحیح نہیں، اور اس کے لئے کسی نبی یا ولی کا انتظار غلط ہے۔(تفصیل کے لئے دیکھئے اس آیت کی تفسیر، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء)

(۴)

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ انسانیت کی دنیا اور آخرت کی فلاح کا سارا دارومدار اِن چار بُنیادی اخلاق کو قرار دیتے ہیں:

(۱)طہارت (پاکیزگی) (۲)اخبات (اعلیٰ و برتر ذات خُداوندی کے حضور میں خشوع وخضوع)

(۳)سماحت (ضبطِ نفس) (۴)عدالت۔

ان چار اخلاق میں مرکزی حیثیت عدالت کو حاصل ہے کسی سوسائٹی میں عدل و انصاف قائم نہیں ہوسکتا، جب تک رزق کمانے والی جماعتوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے سے احترازِ کلّی نہ برتا جائے۔ نُزولِ قرآن کے زمانے میں کسریٰ و قیصر نے متمدن دنیا کے اکثر حصے کو اقتصادی پریشانی میں مُبتلا کر کے اخلاق سے محروم کر دیا تھا۔ اس لئے قرآن عظیم کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ کسری و قیصر کا زور توڑ کر ایسا نظام نافذ کر دیا جائے جس سے اقوام عالم کو اس مصیبت سے نجات حاصل ہو۔

(۵)

قرآن عظیم کی اس انقلابی دعوت کو زندہ کرنے کا ارادہ جب کسی مسلم سوسائٹی میں پیدا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شُرفائے قریش کے وہ خاندان جو مُہاجرین اولین ہونے کا شرف حاصل کر چکے ہیں، وہ ان کی ذہنیت، ان کی معاشی حالت اور ان کی معاشرتی سیرت کو اپنا امام بنائے۔

www.rahimia.org

مسلمانوں میں اس انقلابی رُوح کو پیدا کرنے کے لیے حضرت شاہ صاحبؒ عربی زبان اور عربِ اُوّل کی سیرت کو ایک معیار قرار دیتے ہیں، لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اگر سُفہائے (عربوں کے بیوقوف) عرب جاہلیت عرب کو زندہ کر رہے ہوں، تو اس صورت میں بھی ان کی تقلید کی جائے۔ امام ولی اللہؒ کے اس چوتھے اُصول کو کہ:

"کسی سوسائٹی میں عدل و انصاف قائم نہیں ہوسکتا جب تک رزق کمانے والی جماعتوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے سے احترازِ کلّی نہ برتا جائے"۔(1)

ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکے جب تک ہم نے یورپ میں جا کر سوشلزم کا مطالعہ نہیں کرلیا، جن رُفقاء نے ہمیں اس مطالعے میں مدد دی وہ عموماً کارل مارکس کے متبع تھے، اس کے احترام میں ہمارے یہ رفقاء اس قدر مبالغہ کرتے کہ ہمیں سخت تکلیف ہوتی، اس احترام اور فضیلت کا دارومدار کارل مارکس کے اِقتصادی نظام کو بتاتے تھے۔ ہم حیران رہ گئے جب اس قسم کے انقلابی پروگرام کے تمام حصے ہم نے امام ولی اللہؒ کی تصانیف میں جو کارل مارکس سے بہت پہلے گزرے ہیں نہایت بسط سے مدوّن پائے امام ولی اللہؒ ۱۷۶۳ء میں فوت ہوئے اور کارل مارکس ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا۔

www.rahimia.org

حوالہ جات:

(1) حجۃ اللہ البالغہ، باب سیاسۃ المدنیہ، ص۹۴۔

مقالہ نمبر(۹)

حکمتِ عملی

شاہ ولی اللہؒ کے والد محترم شاہ عبدالرحیم صاحب دہلویؒ کا یہ رُجحانِ فکر کہ وہ حکمت عملی سکھانے پر خاص زور دیتے تھے، غیر معمولی طور پر قابلِ احترام ہے۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ عام متکلمین نے ارسطو کی نظری حکمت کو اپنا مطمحِ نظر (مقصود) بنالیا تھا اور ان کا سارا زور قیاس آرائیوں اور استدلالی بحثوں پر صرف ہوتا تھا، وہ عملی زندگی کی ضرورتوں سے بے خبر تھے، اور حکمتِ عملی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''علم کلام'' میں دلچسپی لینے والے فقہاء متکلمین قومی زندگی کی ضروریات میں تدبُّر اور تفکُّر (غور وخوض) سے محروم ہو گئے۔ شاہ ولی اللہؒ اپنے والد بزرگوار کے مذکورہ بالا رُجحان فکر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت (والد ماجد) شجاعت، فراست، کفایت، غیرت وغیرہ اخلاقِ سلیمہ میں درجۂ کمال پر تھے۔ نیز دینی اور اخروی علوم میں فہم کامل رکھنے کے ساتھ آپ ''عقل معاشی'' سے بھی جس کے ذریعے انسان زندگی کی معاشی اور اجتماعی ضرورتوں کو سمجھتا ہے، پورے طور پر بہرہ ور تھے۔ آپ اپنی مجلس میں اکثر حکمتِ عملی اور کاروبارِ زندگی کے مُعاملات کے آداب کی تعلیم دیا کرتے تھے''۔(۱)

یہ تھی فکری بُنیاد جو شاہ ولی اللہ کو اپنے والدؒ سے اس ضمن میں ورثے میں ملی اور آپ نے اس پر ایک عظیم الشان عمارت کھڑی کر دی، چنانچہ شاہ ولی اللہؒ اپنے حالات میں جہاں دوسرے انعامات الٰہیہ کا ذکر کرتے ہیں وہاں یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

''حکمتِ عملی جس پر اس عہد میں خیر و برکت کا انحصار ہے، کارسازِ قُدرت نے مجھے اس کا وافر حصہ عطا فرمایا اور اس امر کی توفیق دی کہ میں کتاب وسنت اور صحابہؓ کے آثار کی روشنی میں حکمتِ عملی کے اُصول وضوابط مُدوّن کر دوں''۔(۲)

شاہ ولی اللہؒ کی شہرہ آفاق تصنیف ''حجتہ اللہ البالغہ'' کو اگر غور سے پڑھا جائے تو اس میں ایک امتیازی وصف یہ بھی نظر آتا ہے کہ جہاں وہ رفاہِ عام کے اداروں یعنی ارتفاقات

کا ذکر کرتے ہیں، وہاں حکمت عملی کو پیش نظر رکھتے ہوئے تمام احادیث کو اِنہی ابواب پر تقسیم کر دیتے ہیں اور پھر خاص خاص موقعوں پر حدیث کے ذیل میں حکمتِ عملی کا کوئی نہ کوئی نکتہ ذکر کرتے جاتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ کی جملہ تصانیف میں آپ دیکھیں گے کہ سب سے پہلے وہ عبادات کے چار ابتدائی ارکان کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ حکمت عملی کے اصولوں پر اپنے موضوع اور مطالب کو مختلف ابواب پر ترتیب دیتے ہیں، ہمارے نزدیک دین اور دنیا دونوں کو اس نظر سے دیکھنے اور زندگی میں حکمتِ عملی کی غیر معمولی اہمیت کے احساس ہی کا نتیجہ ہے کہ شاہ صاحبؒ حسن و قبح یعنی ''بر'' اور ''اثم'' (نیکی اور گناہ) کی حقیقت کو لفظی گورکھ دھندوں سے الگ کر کے ہر طالبِ حق کے لئے صاف اور واضح طور پر پیش کر سکے۔ حُسن و قبح (اچھائی، برائی) کے معاملے میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تحقیقات کا خُلاصہ یہ ہے کہ:

> ''کسی چیز کو اچھا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نوعی خواص (حقیقی خوبیاں) اس میں بدرجہء کمال پائے جاتے ہوں، مثلاً ایک گدھے کو ہم اچھا کہیں گے تو مطلب یہ ہے کہ بحیثیت ایک گدھا ہونے کے جو لوازمِ ضروری ہیں وہ اس میں پورے موجود ہوں، یہ نہیں کہ وہ مثلاً ایک انسان سے بھی بڑھ کر ہے، اسی طرح اگر ہم ایک پودے کو یا ایک انسانی جماعت کو اچھا کہیں گے تو اس کے نوعی خواص کے اعتبار سے اس کو جانچیں گے اور اس کی حیثیت کا تعیُّن کریں گے۔ چنانچہ ایک انسان کو اچھا کہنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس میں انسانیت کے نوعی خواص ایک حدِّ کمال تک پائے جاتے ہیں، اب جوں جوں کسی شخص میں یہ اوصاف کم درجے کے ہوں گے۔ اسی حساب سے اس کی اچھائی میں نقص پیدا ہوتا چلا جائے گا''۔(3)

لیکن یہ سوال کہ آخر انسانیت کے اوصاف کیا ہیں؟ اس کا جواب ایک ماہرِ حکمت کے نزدیک یہ ہوگا کہ تمام قوموں اور نسلوں کا جائزہ لو اور ان میں جو اچھے اوصاف مشترک پائے جاتے ہیں ان پر انسانیت کا مصداق ہوگا۔ یہ ہے وہ معیار جس پر آپ ہر انسان اور ہر گروہِ انسانی کو پرکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اچھائی اور برائی یا حُسن و قبح کو اس طرح متعین کرنے میں خیال سے زیادہ عمل کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور یہ حکمتِ عملی کو اساسی فکر

ماننے کا لازمی نتیجہ ہے۔

"حجۃ اللہ البالغہ" کو پڑھ کر دیکھئے تو شاہ ولی اللہ صاحبؒ کسی عمل کی، کسی خُلق کی اور کسی عقیدے کی خوبی اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ وہ عام افراد میں یعنی مشرق و مغرب اور عجم و عرب میں پایا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا یہ فکر، معدنِ حکمت کا ایک نفیس جوہر ہے، جس سے عام مصنفین کی کتابیں خالی نظر آئیں گی۔ دوسرے علماء کی کتابیں پڑھ کر انسان حُسن و قبح کے معاملے میں کسی واضح حقیقت کا تعین نہیں کر پاتا۔ ہاں اس سلسلے میں وہ خیالی فلسفہ گھڑنے میں ضرور کمال حاصل کر لیتا ہے۔

الغرض شاہ صاحبؒ کے اس اجتماعی فکر کے طفیل طالب علم حُسن و قبح کے بارے میں خیالی فلسفہ طرازیوں کی دلدلوں سے بڑی آسانی سے نکل سکتا ہے اور وہ ان قیاس آرائیوں کی بجائے عملی زندگی میں "حسن" کی تخلیق اور "قبح" کے مٹانے میں سرگرمِ عمل ہونے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا شاہ صاحبؒ کا یہ اُصول اجتماعی پیشِ نظر رہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام دراصل ایک عالمگیر انقلاب کی دعوت ہے۔ قرآن عظیم اسی دعوت کا ترجمان ہے اور قرآن اِن معنوں میں اپنی تشریح آپ ہے۔ شاہ صاحبؒ کے حکمت و فلسفہ کا یہ سب سے اعلیٰ فکر ہے اور اس کی مدد سے ہر شخص قرآن کے مقصودِ اصلی کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ الغرض شاہ صاحبؒ نے اپنے اس اجتماعی فکر کے ذریعے قرآن کو مسلمانوں کے ذہنوں کے قریب کر دیا ہے۔

❁❁❁❁

حوالہ جات:

(1) انفاس العارفین (فارسی)، ص ۸۴۔

(2) انفاس العارفین (اردو ترجمہ)، ص ۲۰۷۔

(3) ملخص من حجۃ اللہ البالغہ، ص ۸۰۵، مبحث السعادۃ۔

مقالہ نمبر (۱۰)

تصوف

تصوُّف کا رُجحان انسانی ذہن کا ایک خاص جوہر ہے، بعض طبیعتوں کو قُدرت کی طرف سے اس جوہر کا وافر حصہ ملتا ہے اور بعض کو کم اور پھر بعض کو اس مَلکہ کی نشوونما کے لیے سازگار ماحول نصیب ہوجاتا ہے۔ اور بعض اس سے محروم رہتے ہیں۔ بہر حال یہ جذبہ کسی نہ کسی حد تک ہر انسان میں ہونا ضروری ہے، لیکن آخر یہ جذبۂ تصوُّف ہے کیا؟ اور انسانی زندگی میں کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟

بات یہ ہے کہ انسان محض گوشت پوست کا نام نہیں، اس گوشت پوست کے اندر ایک چیز ہے، جو بولتی ہے، سوچتی ہے، اور جوارح سے کام لیتی ہے، یہ انسان کا ''میں'' یا ''اَنا'' ہے، اسے نفس کہہ لیجئے یا رُوح کا نام دیجئے اس ''اَنا'' یا ''میں'' کا کام کیا ہے؟ یہ سوچتا ہے، یہ کچھ کہتا ہے اور پھر اس کے لئے جدوجہد کرتا ہے؛ تصوُّف انسان کے اس ''میں'' میں ایک ہیجان پیدا کرتا ہے، اسے ایک ولولہ دیتا ہے، اس میں حرکت پیدا کرتا ہے، کہ وہ سوچے، کچھ چاہے اور اس کے لیے مصروفِ عمل ہو، یہ ایک برقی رَو ہے جو انسان کے اندر دَوڑ جاتی ہے۔ دھرم اور شریعت، پُوجا پاٹ اور نماز روزے کا نام تصوُّف نہیں۔ جذبۂ تصوُّف ان کاموں کو خلوص سے عقیدت سے اور دل و جان سے کرنے کی تلقین کرتا ہے، تصوُّف زندگی میں کوئی خاص راہِ عمل متعین نہیں کرتا، بلکہ راہِ عمل پر ہمّت اور استقامت سے چلانے والا جذبہ ہے۔

یوں تو انسان سب ایک ہیں، سب میں قُدرت نے کم و بیش ایک سے خصائص ودیعت (عطاء) کئے ہیں؛ اختلاف ہوتا ہے، صرف اِن خصاص سے کام لینے یا نہ لینے سے، تصوُّف ان انسانی خصائص کو اُبھارنے، سنوارنے اور ان سے مُفید کام لینے کا ذمہ لیتا ہے۔ اس لحاظ سے تصوُّف کا قیام سب کے لیے ہے، کسی شریعت میں اس کی تخصیص نہیں۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ شریعت کی ضرورت نہیں۔ تصوُّف تو ان کی روح کو اپنانے کی تلقین کرتا

ہے۔ وہ ایمان پر زور دیتا ہے اور اعمال نیک کی ضرورت بتاتا ہے۔ صوفی شریعت کے بتائے ہوئے رستوں پر چلتا ہے، لیکن اپنی دھن سے، اپنے جذبہ و اُمنگ سے، اس دُھن اور جذبہ و اُمنگ کو پیدا کرنا تصوُّف کا کام ہے۔ تصوُّف انسانی اَنا (خودی) کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب انسان میں یہ باطنی شُعور بیدار ہو جاتا ہے تو وہ اس وقت یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ "اَنا" کسی اور وُجودِ برتر کا پَرتَو ہے، یا یہ انسانی "اَنا" کسی بڑے "اَنا" کا فیضان ہے۔

اس خیال کی مزید وضاحت یُوں سمجھئے! کہ ایسی انانیت کو بیدار کرنا انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا اصل مقصد ہے۔ جب اس زندگی میں کسی فرد کی انانیت بیدار ہو جائے تو موت کے بعد جب بدن اور اس انانیت میں جُدائی ہو جاتی ہے تو یہ اَنانیّت دوسری دُنیا میں بلاخوف و خطر ترقی کی راہیں طے کرتی چلی جاتی ہے۔ اسے ہم فوز و فلاح اور جنت کہتے ہیں۔ اور جس کی انانیت خوابیدہ رہی اور ظلم و ستم کی وجہ سے اس نے اپنی اَنانیّت کو ڈھانپے رکھا تو اس زندگی کے بعد جہنم کا عذاب اِن پردوں کو جلا کر پھر اس کی اَنانیّت کو مجلّٰی (روشن) اور بیدار کر دے گا اور جس دن اس شخص کی انانیت بیدار ہو جائے گی، وہ جہنم سے نکل جائے گا۔

فرد کے اندر اس انانیت کا بیدار نہ ہونا، ہمارے نزدیک کفر ہے۔ ہم دین کو اسی بناء پر انسانیت کے لئے ضُروری سمجھتے ہیں کہ اس پر چلنے سے ہر فردِ انسان کی انانیت بیدار ہوتی ہے۔ حقیقت میں تصوُّف دلوں کو دین کی رُوح سے آشنا کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی کو "اِحسان" سے تعبیر فرمایا ہے۔ اِحسان کی یہ کیفیت کتابوں سے پیدا نہیں ہوتی، بلکہ یہ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے اور ان کی توجُّہ سے حاصل ہوتی ہے۔

ہماری ایک تو خوش بختی یہ تھی کہ خُدا نے ہمیں اسلام کی نعمت سے سرفراز فرمایا، اور دوسرا کرم اس نے یہ کیا کہ مُرشد اور اُستاد ایسے عطا فرمائے جن کے فیضِ صحبت سے ہم اپنی دلی مراد کو پہنچ گئے۔ الغرض ہمارے دل میں اسلام تصوُّف کے ذریعے رچا اور ان بزرگوں اور مُرشدوں کے فیضِ صحبت سے ہمیں ایسی طمانیت نصیب ہوئی کہ سخت سے سخت مصیبت میں بھی ہمارا دل کبھی ہراساں نہیں ہوتا۔

ہماری زندگی ایک بے معنی کھیل نہیں، ہم ایک مقصد لے کر دنیا میں آئے ہیں اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے جو ہم جدوجہد کرتے ہیں، وہ ہمیں بعد میں ایک اور اعلیٰ اور برتر زندگی کا حقدار بنا دیتی ہے، یعنی زندگی کی ان تمام قدروں پر ایمان جسے ہم آسان لفظوں میں خُدا کہہ دیتے ہیں یہی ایمان وعقیدہ ہے جو ہماری زندگی میں سب سے بڑا محرک رہا ہے۔ اس ایمان وعقیدہ میں اس قدر پختگی اور استقامت کہ دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے لیکن اس میں تزلزُل نہ آئے۔ یہ سب تصوُّف کی دین (عطاء) ہے، علم کے ذریعے تو انسان دلیل اور منطق کے زور سے اپنے مقصد پر ایمان لاتا ہے، لیکن صاحبِ تصوُّف اپنے مقصد کو آنکھوں کے سامنے موجود پاتا ہے۔

ہم جو کچھ کہتے ہیں یا جو کچھ کرتے ہیں اس سے ہمارا مقصد صرف اُسی ذات اقدس کی خوشنودی ہے اور ہمیں اس امر کا یقین ہے کہ جو پروگرام ہم اپنی قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں اس میں قوم کی فلاح ہے اور زندگی کی جو نئی قدریں ہم قوم کو دیتے ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ بدلے ہوئے زمانے میں قوم کو انہی کی ضرورت ہے۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ زمانے کا تقاضہ خُدا کی مشیت کے تابع ہوتا ہے اور زندگی کے اسباب وحالات جس نظام کے مُتقاضی ہوتے ہیں، خُدائی مصلحت اس نظام کو دُنیا میں نافذ کرنا چاہتی ہے، اور یہی اس کی مرضی ہوتی ہے، لیکن خُدا کی یہ مرضی اس کے بندوں کے ذریعے ہی دنیا میں عملی جامہ پہنتی ہے اور اللہ کا ہاتھ بندوں کے ہاتھ کے اندر کام کرتا ہے۔ اس لیے بسا اوقات سیاسی کام بھی الٰہی کام ہوتے ہیں اور سیاست عبادت بن جاتی ہے۔

ہم وطن سے نکلے اور افغانستان پہنچے، وہاں ہمیں نئے نئے حالات سے سابقہ پڑا، روس گئے تو بالکل اور دُنیا نظر آئی۔ جن مزعُومات میں ہماری ساری زندگی گُزری تھی، روس میں اُن کو ایک ایک کر کے ٹوٹتے اور مٹتے دیکھا اور نئے اصولوں پر زیادہ جاندار نظام بننے کا مُشاہدہ کیا، پھر ترکی میں بھی کم وبیش یہی کچھ ہمارے سامنے ہوا۔ اس تمام زمانے میں ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے مذہب کے اساسی عقیدہ پر شک وشُبہ نہیں ہوا۔ اور ہمارا دینی فکر رُوسی انقلابیوں کے لادینی فکر سے بلند تر رہا اور ان کی تمام تر مادیت کو ہمارے الٰہی فکر نے اپنے اندر ہضم کر لیا۔ یہ سب شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات کا فیض تھا کہ انقلاب کے ان

طوفانوں کے مقابلہ میں ہم محض تصوّف کی برکت سے اِسلام پر ثابت قدم رہے۔

شاہ صاحبؒ کے تصوّف میں باطنی شُعور کو سنوارنے اور اُبھارنے کا ایک ایسا نظام ملتا ہے جو خالص اِسلامی ہے اور انسانیت عامہ سے بھی ہم آہنگ ہے۔ نیز شاہ صاحبؒ کا یہ تصوّف موجود لادینی فکر کا صحیح مُصلح ہے اور مسلمان اس کی وجہ سے ''یورپین ازم'' (یورپ کی ترقیات اختیار کرنے) کے بعد بھی اپنے مذہب سے وابستہ رہ سکتے ہیں۔

یہ ہے تصوّف! تصوّف کا لفظ سُن کر عام طور پر قدامت پسندی اور رجعت پسندی کا خیال آتا ہے اور تصوّف عموماً عمل اور اِقدام کی ضد سمجھا جاتا ہے لیکن تصوّف ''نہایت اندیشہ و کمالِ جنون'' کا مجموعہ ہے۔ اور ہمارے عمل کے سوتے اسی سے پھوٹتے ہیں۔ اس تصوّف ہی نے ہمیں ہر خطرے اور ہر مصیبت میں خُدا کے دامن سے وابستہ رکھا اور اسی کا احسان ہے کہ ہمارا خُدا پر عقیدہ اس قدر وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ اس میں ساری قومیں سما گئیں، سارے ادیان آ گئے، کُل کی کُل انسانیت، اس کے اندر جذب ہو گئی اور ساری کائنات کا اُس نے احاطہ کر لیا اور یہ عقیدہ ان تمام قیود و حُدود سے پھر بھی بلند و برتر رہا۔ تصوّف نے ایک طرف ہمارے ذہن و فکر میں اس قدر وسعت و ہمہ گیری پیدا کی اور دوسری طرف ہمیں اتنا یقین اور استقامت بخشی کہ ہم اس باطنی شُعور کو خارج میں لانے کے لیے ہمیشہ جدوجہد کرتے رہے۔ اور ناسازگار حالات اور مادی مشکلات کی کبھی پرواہ نہ کی، ہمارا کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں کا عہدِ اِقبال تھا اور ان کے قُویٰ میں جان تھی تو ان کا تصوّف کا جذبہ تمام تر عمل پر مرکوز رہا۔ بعد میں جب قوم کے قویٰ مضمحل (کمزور) ہو گئے تو جمہور کا تصوّف محض اندھا دھند عقیدت بن کر رہ گیا، لیکن اسے یہ سمجھنا کہ تصوّف نہ تھا تو مسلمان برسرِ عروج تھے، تصوّف کا دور دورہ ہوا تو ان کا زوال شروع ہو گیا تصوّف کی اصل حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے، اربابِ تصوّف کی بے عملی کا باعث تصوّف نہ تھا، بلکہ اُس زمانے کے حالات نے اُن میں جمود اور بے عملی پیدا کر دی تھی۔

جہاں تک برصغیر کا تعلق ہے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس تصوّف کے ارتقاء کی آخری کڑی ہیں۔ انہوں نے اس تصوّف کی جو تعبیر کی ہے وہ صحیح معنوں میں ہماری ذہنی زندگی کی اساس (بُنیاد) بن سکتی ہے۔

مقالہ نمبر (۱۱)

ارتفاقات

اپنی دُنیوی زندگی میں انسان بہت سی مشکلات اور بہت سی تکالیف سے دوچار ہوتا ہے عقل مندوں نے ان مشکلات اور تکالیف میں سے بعضوں کے لئے حل تلاش کر لئے ہیں اور بقیہ کی تلاش کے لئے کوشاں ہیں۔ جن طریقوں سے معاشی اور اقتصادی پریشانیوں پر بآسانی قابو پایا جاسکتا ہے۔ انہیں اصطلاح میں ''ارتفاقات'' یا ''مرَافِق'' کہتے ہیں۔

لفظ ''ارتفاق'' کا مادہ ''رفق'' ہے اس کا مطلب ''نرمی'' یا ''نرمی سے کام لینا'' ہے، اس کو یوں سمجھ لیجئے! کہ کائنات میں وہ تمام اشیاء جو انسان کے لئے مفید ہیں وہ خود بخود اس کے تصرف (استعمال) میں نہیں آئیں، بلکہ یہ مثل خام مال کے ہیں، جسے حسب ضرورت استعمال کے لئے ڈھالا اور تیار کیا جاتا ہے۔ یہ اشیاء انسان کو اپنی سہولت اور فائدے کے مطابق تیار کرنی پڑتی ہیں۔ ایسی سہولت اور فائدے کو ''ارتفاق'' کہا جاتا ہے۔

انسانی ارتفاق (تہذیب وتمدُّن) کی چار منزلیں ہیں:

ارتفاق اوّل

اس میں نوعِ انسانی کے تمام افراد کو چند بُنیادی اشیاء کی یکساں ضرورت پڑتی ہے، مثلاً کھانا کپڑا اور مکان۔ ان بُنیادی ضروریات کی تکمیل انسان کی طبعی ضرورت میں داخل ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے! کہ فطرت انسانی کا تقاضہ تھا کہ اِن چیزوں کا علم اسے طبعی طور پر ہو، اسی لئے وہ کاشت کا کوئی نہ کوئی طریقہ تلاش کرتا ہے، پانی کے انتظام کے لئے مختلف طریقے نکالتا ہے اور پیٹ بھرنے کے لئے بھی کچا پکا کھانا تیار کر لیتا ہے۔ آگے چل کر وہ

حیوانات کو اپنا تابع بناتا ہے اور ان کی اُون اور چمڑے سے اپنے لئے لباس بناتا ہے۔ درندوں سے اپنی حفاظت کے لئے گھر بناتا ہے، اپنی جنسی خواہش کی تکمیل اور اپنی نسل کو قائم رکھنے کے لئے ایک عورت سے نکاح کرکے اپنے ساتھ رکھتا ہے اور اس بات کا خواہاں رہتا ہے کہ کوئی دوسرا اس مُعاملے میں مُداخلت نہ کرے۔

ارتفاق اوّل کی مثال ہمیں حضرت آدم علیہ السلام کی زندگی میں ملتی ہے۔ ابتداءً انسان کو اپنی بُنیادی ضروریاتِ زندگی کا طبعی طور پر اِلہام ہوا، کہ اگر یہ چیزیں ظُہور میں نہ آتیں تو اس کی زندگی میں رُکاوٹ پیدا ہو جاتی، قلب تکلیف میں مبتلا ہوتا جس کے بعد رواں دواں زندگی ختم ہو جاتی۔

انسان کا الہام اسے بالکل اسی طرح ہوتا ہے جس طرح شہد کی مکھیوں کو اپنی ضروریات کی بابت ہوا کرتا ہے کہ وہ کن پھولوں کا رس چوس کر کس طرح اِس سے شہد بنائیں۔ کس طرح اپنا چھتہ تیار کریں، آپس میں کس طرح مل کر رہیں اور اپنی ملکہ کی کس طرح اطاعت کریں۔ مختصر یہ کہ ہر نوع حیوانی کے لئے ایک جُداگانہ طریقۂ زندگی ہے جو ان کے حالات کے مطابق اِن کے قلوب میں ڈال دی جاتی ہے۔ انسان کی بُنیادی ضروریات میں تمام حیوانات بھی اسکے شریک ہیں، لیکن اپنی خصوصیت کے تقاضے کے مطابق انسان کو تین چیزیں مزید عنایت کی گئی ہیں جن کا وہ بلاشرکت غیرے مالک ہے۔

(1) رفاہِ عام کا تخیُّل

انسان کی ضرورت محض ذاتی بُنیادی ضروریات تک ہی محدود نہیں، بلکہ وہ ان کے ماسوا اور اشیاء کی ضرورت بھی اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ صرف طبعی ضرورت (بھوک، پیاس اور جنسی شہوت وغیرہ) ہی اس کو کسی عمل کے لئے آمادہ نہیں کرتیں، بلکہ اس میں عقلی ضروریات بھی موجود ہیں جو اسے ایسے نفع کے حاصل کرنے اور ایسے نقصان سے بچنے کے لئے تیار کرتی ہیں جن کا تقاضہ صرف عقل انسانی کرتی ہے نہ کہ حیوانی طبیعت۔

وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش میں رہتا ہے کہ وہ ایسے کام کرے جو نہ صرف اس کی ذات کے لئے مفید ہوں، بلکہ دوسرے لوگوں کے لئے بھی یکساں سود مند ہوں۔ اکثر

اوقات اس کا یہ خیال اسے کسی شہر میں ایک بہتر تمدُّنی نظام کے قیام کے لئے اُکساتا ہے تو کبھی خود اپنے اخلاق کی تکمیل اور اپنے نفس کی اصلاح کے لئے دُور رس فوائد کا خیال رکھتے ہوئے اکثر اوقات وہ قریبی نقصان کو برداشت کر لیتا ہے اور کبھی مُستقبل کے نقصانات سے بچنے کے لئے اپنے قریبی فوائد کو قربان کر دیتا ہے اس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی عزّت اور اس کا رُعب قائم رہے۔

(2) شوقِ حُسن و جمال

فطرتِ انسانی، حیوان کی طرح صرف اپنی ذاتی ضروریات پوری کرنے پر ہی قانع نہیں رہتی، بلکہ وہ تو ہمیشہ "خوب سے خوب تر" کی تلاش میں رہتی ہے۔ انسان ہر چیز میں لطافت، تازگی، حُسن اور خوبی کا متلاشی رہتا ہے جس سے اپنی جمالیاتی حِس کو حتی الامکان مطمئن کر سکے۔ مثال کے طور پر حیوانی حاجت محض وہ غذا ہے جس سے بھوک رفع کی جائے۔ اور زندگی کی حرارت باقی رہے۔ لیکن انسان اس میں بھی لذت اور لطافت کا طلب گار رہتا ہے اور اپنے اِسی اطمینان کے لئے طرح طرح کے کھانے تیار کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اچھے سے اچھا خوش نُما لباس زیب تن کرے۔ بہترین گھر میں سکونت اختیار کرے اور ایک نہایت حسین بیوی اس کی شریکِ حیات ہو۔

(3) ایجاد اور تقلید کا مادہ

جس طرح انسانی ضرورت کی نوعیت حیوانی ضروریات کی نوعیت سے مختلف ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان کو ہونے والے الہام کی کیفیت بھی حیوانی الہام کی کیفیت سے مختلف ہے۔ پھر حیوانات کے برعکس انسانوں کے اوپر ان کی تمام ضروریات کے متعلق ہونے والا الہام بھی ایک ہی قسم کا نہیں ہوتا۔ بلکہ ضروریات کے اختلاف کے ساتھ ساتھ الہام کے وقت اور اس کی قسم میں بھی اِختلاف ہوتا ہے۔ انسان ان الہامات سے اپنے فوائد اور دیگر مُفید طریقوں میں مدد لیتا ہے۔

بسا اوقات بہت سی حاجتوں کا کچھ لوگوں کو خیال ہی نہیں آتا، آتا بھی ہے تو انہیں پورا

کرنے کا کوئی بہتر طریقہ سمجھ نہیں آتا، ایسے موقع پر دوسرے لوگ ان کی مدد کرتے ہیں، انہیں الہام ہوتا ہے اور وہ اپنے ذہن سے کوئی کارآمد طریقہ ڈھونڈ نکالتے ہیں اور دوسرے لوگ اس طریقہ سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اس منزل پر دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ لوگ اتفاق رائے سے اپنے میں سے کسی ایک کو اپنا سربراہ چُن لیں اور اس کے معتقد ہو جائیں تا کہ وہ ان کے ابتدائی تمدُّن کو بہتر بنا سکے اور مُشکل کے وقت ان کے دُشمن کے خلاف مددگار ثابت ہو سکے۔

اپنے پیش رو کی تلاش اور اس کی پیروی میں اپنی زندگی بسر کرنا انسانوں میں ایک بالکل فطری چیز ہے۔ معاشرے کی نشوونُما میں تقلید خُصوصی اہمیت کی حامل ہے اگر تقلید کا جذبہ فطرتِ انسانی میں داخل نہ ہوتا تو معاشرے کی تکمیل کے لئے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا، انسان باعتبار فہم و دانش (سمجھ بوجھ) ایک دوسرے سے مختلف ہے، چنانچہ وہ تقلید کے لئے آمادہ رہتا ہے اسی وجہ سے حُسن و لطافت کی جستجو، مُفید تدابیر کی ایجاد، اُصول و قواعد کی پیروی نیز غور وفکر کے لئے بہ اعتبار فطرت، انسان ایک دوسرے سے بڑی حد تک مختلف ہیں، یہ کام صرف چند لوگوں کے ذمے ہوتا ہے جو صاحبِ فہم و فراست (عقل مند) ہوں اور پھر دوسرے ان کی پیروی کریں۔ ارتفاق اول میں یہ بھی ضروری ہے کہ سادہ لوح لوگوں کے اس مجمع میں بعض عقل منداور دانا لوگ بھی پائے جاتے ہوں، جو ان کے تمدُّنی نظام کی ترقی کے لئے کوشاں رہیں۔ نیز ان میں چند ایسے بھی ہوں جو صُلح صفائی، امن و آشتی کی زندگی کے مُتلاشی ہوں۔ ساتھ ہی بلند اخلاق، سخی، عادل، باہمت اور بہادر بھی ہوں۔

ارتفاق اول کو جماعتی زندگی اور انسانی معاشرے کا سنگِ بُنیاد کہا جاتا ہے کیونکہ اس درجے کے جماعتی کاموں سے انسانوں کا چھوٹے سے چھوٹا گروہ بھی آزاد اور بے نیاز نہیں ہو سکتا، کوئی بھی انسانی جماعت خواہ وہ صحرا میں خیمہ زن ہو یا پہاڑوں کی بلند ترین چوٹیوں پر رہتی ہو، اس درجہ اول کے اجتماعی اداروں سے کسی حال میں بھی خالی نظر نہیں آئے گی۔

اللہ رب العزت کی یہ مرضی تھی کہ قرآن کریم تمام اقوام عالم کے لئے سرچشمۂ ہدایت

ثابت ہو اور ان کے دین و دنیا کی کامیابی کا باعث بنے۔ اسے یہ علم تھا کہ تمام درجہ ہائے ارتفاق میں درجہ اولٰی کا ارتفاق ہی دراصل ایسا ہے کہ خطۂ ارض پر بسنے والی تمام قومیں اسے بغیر کسی عذر کے قبول کر سکیں گی، چنانچہ ان کے لئے اس ارتفاق کی بقا لازمی ہے۔

ذرا سی لفظی تبدیلی سے مقصود کا اظہار یوں بھی ہو سکتا ہے کہ یہی ارتفاق ایسا ہے کہ جس کی پابندی کرنا انسانوں کی تمام اقوام اور ملتوں کے لئے لازمی ہے، اس کو چھوڑ کر اجتماعی زندگی کے خواب کا شرمندۂ تعبیر ہونا نہ صرف دُشوار ہے، بلکہ ناممکن بھی۔

ارتفاقِ دوم

ارتفاقِ اول کے مسائل کو صحیح تجربات کی کسوٹی پر کسنا، ارتفاق دوم کا ایک بُنیادی اُصول ہے۔ ان تجربات کی روشنی میں ارتفاق کے تمام شعبوں میں وہ باتیں اختیار کی جاتی ہیں جس میں نفع کا فیصد زیادہ سے زیادہ اور نقصان کی شرح کم سے کم تر ہو۔ اگر کوئی رسم یا عادت اس مرکزی اُصول سے ٹکراتی ہے تو اسے فی الفور ترک کر دیا جاتا ہے، ارتفاق کی اس دوسری منزل میں ارتفاق اول کے آداب کی از سرِ نو چھان بین ہوتی ہے۔

اگر یہ آداب کسی شریف اور کامل کی نگاہ میں معتدل نہیں ہوتے تو ان میں مُناسب ترمیمات اور تغیُّرات (تبدیلیاں) کئے جاتے ہیں انہیں زیادہ سے زیادہ بُنیادی اُصول کے موافق بنایا جاتا ہے۔ ان آداب کا ہر پہلو اور ہر طریقہء کار ہمیشہ رائے کلی (مفاد عامہ) کے حسبِ منشا ہونا چاہئے اور ان میں ہمیشہ عام مصلحت کو پیشِ نظر رکھا جائے جن میں عمومی خوبیوں کو خصوصی مصلحت پر ترجیح حاصل ہو۔

اس اِرتفاق میں ان آداب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے جو انسان کے طعام، لباس، نشست و برخاست، خلوت و جلوت، رہائش، نیز غم اور مُسرّت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً طعام کے آداب میں یہ بات شامل ہے کہ انسان مُردہ جانوروں کے گوشت سے پرہیز کرے اور ان جانوروں کے گوشت سے بھی جن کا مزاج غیر معتدل ہو۔ ہر سلیم الطبع اور مُعتدل مزاج شخص ایسے کھانے سے یقینی طور پر اِجتناب کرے گا۔ اسی طرح کھانا عُمدگی سے تیار کیا جائے، نفاست سے پیش کیا جائے اور کھانے سے پہلے ہاتھ مُنہ پانی سے اچھی طرح

دھولئے جائیں۔ صاف پانی استعمال کیا جائے اور برتن میں ڈال کر پیا جائے، نہ کہ جانوروں کی طرح برتن میں مُنہ ڈال کر۔

ارتفاق ثانی کی مثال ہمیں حضرت ادریس علیہ السلام کی زندگی میں ملتی ہے۔ عام صفائی کا معنیٰ یہ ہے کہ انسان اپنا جسم صاف اور نجاست سے پاک رکھے، مُنہ میں پیدا ہونے والے تعفّن کو مسواک اور منجن کے استعمال سے دُور کرے، بغل اور زیر ناف کے بال برابر صاف کرے۔ سَر اور داڑھی کے بال عُمدہ طریقے سے کٹوائے، سُتھرے ملبوسات زیبِ تن کرے، اور گھر کو صاف رکھے۔ لباس کے ضمن میں اس بات پر خصوصی توجُّہ دے کہ اس سے جسم کا بیشتر حصہ ڈھکا رہے اور ستر پوشی بھی مکمل ہو۔

مستقبل کے حالات وقواعد سے خود کو آگاہ رکھنے کا میلان انسان میں طبعی ہے۔ نیز ساری دُنیا میں عام طور پر اس کا رواج پایا جاتا ہے اس لئے بعض موقعوں پر خوابوں کی تعبیرات اور مستقبل کے علم کے لئے رمل اور علم نُجوم سے مدد لی جاتی ہے، کیونکہ آنے والے حالات کو معلوم کرنے کا فکر، کم وبیش دنیا کی تمام اقوام میں پایا جاتا ہے۔

ارتفاقِ دوم میں یہ بھی ضروری ہے کہ انسان تقریر کی فصاحت، لہجے کی عام فہمی اور اُسلوب کی سلاست (طریقۂ کار کی بہتری) کا بھی خیال رکھے اور ان خصائص (خوبیوں) کو اپنی گفتگو میں استعمال بھی کرے۔

ارتفاق کا یہ دوسرا درجہ ''تدبیر منزل'' یعنی خاندانی زندگی کو بہتر طریقے پر قائم رکھنا کہلاتا ہے۔ اس میں خاص طور پر ان چار باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔

1۔ خاوند بیوی کے ایک دوسرے پر حُقوق اور اَحکام

چونکہ نوع انسانی کے قیام کے لئے افزائشِ نسل نہایت ضروری ہے اس لئے مُناسب یہ ہے کہ خاوند اور اس کی بیوی آپس میں خوشگوار زندگی بسر کریں اور اولاد کی پرورش میں عورت کا حصہ طبعی طور پر زیادہ ہے، نیز گھر کے کاموں کو اچھے انداز میں سرانجام دینے کی صلاحیت بھی اس میں کامل طور پر موجود ہے اس کی فطرت میں فرمانبرداری اور اطاعت مرد سے زیادہ ہوتی ہے۔ مرد کے اوصاف عورت کی صفات سے اکثر مختلف ہیں۔ یہ فہم ودانش

اور پیچیدہ معاملات کو سلجھانے میں عام طور پر عورت پر فوقیت رکھتا ہے۔ مشکلات سے نمٹنا، سخت محنت اور مشقت کے کاموں کو بجا لانا بھی گویا اس کے ذمے ہے ان خوبیوں کی جانب وہ طبعاً مائل ہے یہ دونوں مل کر اپنی خصوصیات کے اختلاف کے باوجود بہتر طور پر ''تدبیرِ منزل'' (خاندانی زندگی کو بہتر طریقے پر قائم کرنا) کے لئے ایک دوسرے کے محتاج اور ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ چونکہ مرد عام طور پر عورت کی نسبت زیادہ غیرت مند ہوتا ہے، نیز اس میں مَردانگی اور شجاعت کے جذبات کا ملاً موجود ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ہر مرد کے لئے ایک مخصوص عورت ہو، جس میں دوسرے کو دخل اندازی کی اجازت نہ ہو۔ مرد اور عورت کے نکاح کی تقریب کُھلی مجلس میں ہونی چاہئے، تاکہ ہر وہ دوسرا شخص جو اس عورت کو اپنانے کا خواہش مند ہو چشم دید دوسرے شخص کے ساتھ منسوب ہوتا دیکھ کر اس کی جُستجو سے کنارہ کش ہو جائے، مرد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ''حقِ مہر'' کے ساتھ اپنی عورت کی مزید دیگر ضروریات بھی پوری کرے، تاکہ عورت کے دل میں اس کے لئے وَفا، محبت اور تکریم کے جذبات پیدا ہوں، شادی کے بعد یہ ضُروری ہے کہ میاں بیوی اپنے تعلُّقات بہت دلچسپ بنائیں تاکہ وہ زندگی کی اس طویل شاہراہ پر حقیقی معنوں میں ایک دوسرے کے ہم سفر شریک اور معاون ثابت ہو سکیں اگر آپس میں ناگوار تعلقات اور کشیدگی اس درجے کو جا پہنچے کہ باہم ساتھ رہنا ناممکن ہو جائے تو ایسے موقع پر طلاق بہتر حل ثابت ہوتی ہے۔ کہ برضا و رغبت علیحدہ ہو کر زندگی کے باقی ایام آرام اور چین سے گُزار لیں۔

2۔ اولاد اور ماں باپ کے باہمی حقوق

تدبیرِ منزل کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اولاد کی پرورش، تربیت عمدہ طریقے سے ہو، اُنہیں بہتر تعلیم دی جائے، ان کی صحت کا خاص خیال رکھا جائے، نیز ان میں اخلاق کی بلندی پیدا کرنے کے لئے مُناسب ماحول فراہم کیا جائے۔

اولاد پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان کوششوں، مشقتوں اور تکلیفوں کا پورا خیال رکھیں جو ان کی مُناسب تربیت اور پرورش کے لئے اُن کے والدین نے برداشت کی تھیں

اور ان کی عزت و تکریم سے اپنا دامن نہ بچائیں ان کا کہنا مانیں، کبھی تلخ کلامی سے پیش نہ آئیں اور وہی سلوک و احسان کریں؛ جو انہیں والدین کی جانب سے ملا تھا۔

3۔ خدمتگاروں کے حقوق

اس ضمن میں حاکم اور محکوم کا باہمی تعلق بھی اہم درجہ رکھتا ہے۔ انسانی نفسیات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہے کہ رُوئے زمین پر بسنے والے تمام انسان مزاجاً یکساں نہیں ہوتے، بعض طبعی طور پر قیادت کے اہل ہوتے ہیں۔ اور حاکم بننے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں تو بعض اس سے محروم رہتے ہیں، تمام انسانوں کے درمیان یہ اختلاف ان کی استعداد کے اختلاف کا نتیجہ ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے مُشاہدے میں روز ہی ایسے لوگ آتے ہیں جو پیدائشی طور پر روشن دماغ اور اعلیٰ فہم کے مالک ہوتے ہیں اور ایسے بھی جو کم فہم اور کُند ذہن ہوتے ہیں، چنانچہ ایک بہتر زندگی کی خاکہ کشی (تعمیر) کے لئے ان دونوں اقسام کا وجود لازمی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ نتیجتاً ایک کی مسرت اور راحت دوسرے کی مسرت اور راحت سے وابستہ اور اس کی رہین منت (احسان مند) ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ دونوں اس باہمی رشتہ کو مضبوطی سے قائم رکھیں، نیز ایک دوسرے کے رنج و غم، شادی و مسرت میں برابر کے شریک ہوں۔

4۔ صلہ رحمی اور رشتہ داروں کے حقوق

اس سلسلے کی چوتھی کڑی عام انسانوں کے آپس میں رہن سہن اور تعلقات سے متعلق ہے، بعض افراد اتفاقی حادثات اور بیماریوں کے سبب مختلف تکالیف میں مُبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں ذی استعداد (قابل اور صلاحیت) لوگوں کو ان تکلیف زدہ لوگوں کی مدد کرنی چاہئے اور ان کا سہارا بننا چاہئے۔ ان کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھنے چاہئیں تاکہ یہ لوگ احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔ اسی طرح تمام شُعبوں میں ایک دوسرے کی مُعاونت بھی اچھی مُعاشرت کا جُزو ہے۔ علاوہ ازیں مُشکل اوقات میں رشتہ داروں کا ایک دوسرے کے کام آنا جسے شرعی اصطلاح میں ''صلۂ رحمی'' کہتے ہیں ایک اہم

www.rahimia.org

اور ضروری فرض ہے۔

''ارتفاق اول'' انسانی ترقی کی پہلی منزل ہے، جب نوعِ انسانی ابھی اتنی پھلی پھولی نہ تھی لوگ جنگلوں یا چھوٹے چھوٹے دیہاتوں (گوٹھوں) میں رہتے تھے اور اپنی جماعت میں سے کسی بڑے کے ماتحت رہا کرتے تھے، انسانی معاشرے کا یہ دور اولین تھا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ نوع انسانی جو پہلے اقلیت میں تھی، اکثریت میں تبدیل ہوگئی۔ حتی کہ اس کے افراد کا شمار ہزاروں میں ہونے لگا۔ زندگی میں ایک تنوّع (رنگا رنگی) پیدا ہوا اور باہمی معاملات میں اضافہ ہوا، چھوٹے چھوٹے گاؤں کشادہ، وسیع اور بارونق شہروں میں بدل گئے اور ایک اچھا خاصا تمدُّنی نظام وُجود میں آگیا۔ اب اس نظام کے تحت انہوں نے اپنی زندگی بسر کرنی شروع کی۔ یہ شہری زندگی دراصل ''ارتفاق ثانی'' کا دوسرا نام ہے۔

یہاں سے ''ارتفاق سوم'' کی حدود شروع ہوتی ہیں، یعنی انسانی معاشرے کے یہ چاروں درجے (ارتفاقات) یکے بعد دیگرے ترتیب سے آتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ دوسری منزل پہلی منزل سے پیشتر معرض وجود میں آچکی ہو۔ اجتماعی شکل یا مُعاشرے دوسرے درجہ میں اُس وقت قدم رکھتے ہیں جب پہلا درجہ عبور کر چکے ہوں۔ البتہ یہ ضروری نہیں کہ دوسرا درجہ اُسی وقت وُجود میں آئے۔ جب پہلا تکمیل کے سارے مراحل طے کر چکے نیز اس کا ہر پہلو حُسن وخوبی کے عین معیار کے مطابق ہو۔

معاشرے کا ہر درجہ دو اقسام کے عناصر پر مُشتمل ہوتا ہے۔ ایک عنصر اس کے وُجود کے لئے لازمی ہوتا ہے۔ نیز مُعاشرے کا رکن ہوتا ہے اور دوسرا اگر معدوم (ناموجودہ) بھی ہو تو معاشرے کی بُنیاد متاثر نہیں ہوتی۔ مُعاشرے کا وُجود تو قائم رہتا ہے البتہ اس میں حُسن وخوبی کی کمی رہ جاتی ہے، مُعاشرے کے ہر دوسرے درجے میں انسان اس وقت بھی پہنچ سکتا ہے، جب کہ درجہ اول کے صرف ارکان ہی موجود ہوں۔ مثلاً جب انسان کو اپنی طبعی حاجتوں یعنی بھوک، پیاس، اور جنسی جذبہ کی آسودگی (تکمیل) میسر ہو۔ پہلی منزل میں حُسن وخوبی پیدا کرنے والے عناصر دوسری منزل میں قدم رکھنے کے بعد بھی پیدا ہوسکتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات تو انسان معاشرے کی ہر بلند منزل پر متمکن ہونے کے بعد

پہلے درجے کے عناصر میں حُسن و خُوبی اور کمالِ شائستگی (سلیقہ) پیدا کرنے کرنے پر زیادہ قادر ہو جاتا ہے۔

ارتفاق سوم

یہ ارتفاق، سیاستِ مُدُن (شہریت) سے تعلق رکھتا ہے جو مختلف شہروں کے مختلف باشندوں کے باہمی تعلقات کا نام ہے اس کی مثال ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی سے ملتی ہے۔

اس ارتفاق میں ہر قوم خواہ اس کے افراد کی تعداد لاکھوں سے ہی زیادہ کیوں نہ ہو ایک شخص کے مانند سمجھی جاتی ہے، چنانچہ جب قوم کے کسی ایک فرد کو کوئی نقصان یا غم پہنچتا ہے تو اس سے اس شخص کی طرح پوری قوم مُتأثر ہوتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح کہ جب جسم کے کسی حصے کو تکلیف پہنچتی ہے، تو سارا جسم اس سے مُتأثر ہوتا ہے، اس منزل میں لوگوں کی ضروریات کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اس کا شُمار بھی نہیں کیا جاتا اور پھر انسان ان سب میں شائستگی اور حُسن کا طلب گار رہتا ہے۔ چونکہ انسان کا اپنی تمام ضروریات کو تنہا حسبِ منشا عُمدگی سے پورا کرنا ناممکن ہے اس لئے اسے مل جل کر رہنے اور ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے لئے اجتماعی زندگی اختیار کرنی پڑتی ہے جسے "تمدُّن" کہا جاتا ہے۔

اس قسم کے معاشرے میں چونکہ ہر فرد کا پیشہ دوسرے فرد کے پیشے سے مختلف ہوتا ہے اس لئے باہمی تعاوُن اور مدد کی ضرورت لازمی ہو جاتی ہے اور پھر ان میں ایک سیاسی نظام کا پیدا ہونا لازمی ہے کیونکہ یہ اُن کی ضرورت ہے۔ باہمی لین دین کے لئے اُنہیں تمام امور سے قبل ایک جنسِ مبادلہ (سکہ) کی حاجت ہوتی ہے جسے وہ غور و فکر کے بعد سونے چاندی کے سِکّوں کو ڈھال کر پورا کرتے ہیں کاروبار کی اقسام اور ان کی زیادتی کے سبب ہر فرد اپنے پیشے میں اپنی صلاحیت کے مطابق عُمدگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بس یہیں سے تمدُّن کی صحیح معنوں میں تکمیل ہوتی ہے۔

چونکہ اہل شہر کو آج کی اصطلاح میں "اہل تمدُّن" کہا جاتا ہے اور ان کی تعداد

www.rahimia.org

بے شمار ہے اس لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ہر وقت ایک مکمل عاذلانہ نظام کے پابند رہیں، اور کبھی اس کی خلاف ورزی نہ کریں۔ چنانچہ کسی حکمران کا ہونا ضروری ہے جسے عقل مند لوگوں نے متفقہ طور پر منتخب کیا ہو اور وہ فی الواقعہ ایسی قوت وصلاحیت کا مالک بھی ہو، جو لوگوں کو مقررہ قوانین کی پیروی پر مجبور کر سکے تاکہ بدامنی اور انتشار نہ پھیلے۔

اس حاکم کو مختصراً جن اوصاف کا حامل ہونا چاہئے ان میں شجاعت، بُرد باری، تحمّل، شیر دِلی اور عُمدہ اخلاق سب سے اہم ہیں تاکہ لوگ اس سے متنفر نہ ہوں، بلکہ مرعوب ہوں، اس کے ساتھ ساتھ ملک کے نظم ونسق کو چلانے کا سلیقہ بھی رکھتا ہو، معزز اور شریف ہو، ہمیشہ رعایا کی بھلائی کا خیال رکھے، حکمتِ عملی برتے، اِخلاص کا پیکر ہو، تاکہ ہر دلعزیزی حاصل ہو سکے۔

اس حاکم کو یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنی رعایا کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے حد درجے شعور اور ہوشیاری کا ثبوت دے یہ ٹھیک ہے کہ حکومت یا حاکم کو اپنی رعایا کے ساتھ نہایت فیاضانہ سُلوک رَوا رکھنا چاہئے۔ تاہم مجرمین کو ان کے کیفر کردار تک پہنچانے میں سُستی سے قطعاً کام نہ لیا جائے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ مجرم کو سزا، جُرم ثابت ہونے کے بعد دی جائے۔ علاوہ ازیں جو لوگ نہایت دیانتداری سے اپنے فرائض انجام دیں اُن کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کی جائے۔ مختصر یہ کہ حاکم ایسا مردم شناس اور روشن دماغ ہو، کہ ایک جَھلک دیکھ کر ہی آدمی کی اندرونی صلاحیتیں پہچان لے، نیز وہ ایسی گہری نظر رکھتا ہو، کہ فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ جائے اور اس کے نتائج سے باخبر ہو جائے۔

ملک کا حاکم تن تنہا سارے نظام مملکت کو چلانے سے قاصر ہے، تمام شعبہ ہائے مملکت کے نظام کو بہتری اور عُمدگی سے چلانے کے لئے وہ مددگاروں کا محتاج ہے۔ چنانچہ وہ خوب ٹھونک بجا کر مددگار عملے کا انتخاب کرے۔ تقرر کے وقت اس بات کا خاص خیال رکھے کہ عملے میں کسی ایسے شخص کو عُہدہ نہ مل جائے کہ جسے مستقبل میں اپنی بدنیتی اور خیانت کے سبب برطرف کرنا مشکل ہو جائے۔ اکثر لوگ ذاتی اغراض کی بناء پر حکومت میں داخل ہو جاتے ہیں، بس ضروری ہے کہ پہلے انہیں سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کی جائے ورنہ بصورتِ دیگر انہیں مُعطل کیا جائے۔ حاکم کو خیال رکھنا چاہئے کہ وہ کسی کارکن

سے اس کی استعداد اور استطاعت سے زیادہ کام نہ لے۔

حکومت کے وسیع کاروبار کو بخوبی چلانے کے لئے مالی وسائل کی ضرورت لازمی پڑتی ہے چنانچہ بہتر یہی ہے کہ ایک بیت المال قائم کیا جائے جس کی آمدنی کا ذریعہ مختلف ذرائع ہوں، آمدن کے ذرائع کو صحیح معنوں میں اس طرح کارآمد بنایا جائے کہ کوئی بھی ذریعہ آمدن ادھورا نہ رہ جائے، اور ہر جگہ سے صحیح طور پر آمدنی حاصل ہو، ان ذرائع میں عام طور پر زمینی ذخائر معدنیات اور زراعت وغیرہ زیادہ اہم ہیں، علاوہ ازیں ضرورت کے وقت کچھ ٹیکس بھی لگائے جاسکتے ہیں، لیکن ٹیکس عائد کرتے وقت ہمیشہ عدل سے کام لیا جائے اور رعیت پر غیر معمولی دباؤ نہ ڈالا جائے، ٹیکس محض انہیں لوگوں سے وصول کئے جائیں جن کا مال روز افزوں ترقی کرتا ہو، یا پھر ان سے جو بڑے صنعت کار ہوں اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ ٹیکس صرف انہی سے وصول کیا جائے جن کی آمدنی ضروریات زندگی کی کفالت سے زیادہ ہو۔

اپنی قوم کو بیرونی خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے حاکم کو افواج کی تنظیم، بہتر طریقہ پر کرنی چاہئے نیز افواج کو منظم، وفادار، اور طاقتور بنانے کے لئے مناسب ذرائع اختیار کرنے چاہئیں، افواج کا اعتماد اور وفاداری اسی پر موقوف ہے کہ حاکم زیادہ سے زیادہ اپنی رعایا کا خیال رکھے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں ان کے لئے مخلصانہ اور بے لوث جذبات کی پرورش کرے۔

تیسرے ارتفاق میں سیاسی نظام کے لئے مندرجہ بالا باتیں ذہن نشین کرنی ضروری ہیں اور انسانی معاشرے کو صحت مند رکھنے کے لئے حسب ذیل پانچ اُمور لائق توجہ ہیں۔

1۔ حرص، بُخل اور حسد سے بچانا

یہ وہ مذموم خصائل ہیں جو افراد معاشرہ کے دلوں میں اختلاف اور کشیدگی کو جنم دیتے ہیں اگر ان اِختلافات اور کشیدگی کو ختم نہ کیا جائے تو نوبت قتل و غارت گری تک جا پہنچتی ہے ایک با اختیار اور قوی سیاسی نظام کا فرض ہے کہ وہ رعایا کے باہمی جھگڑوں کا منصفانہ طور پر فیصلہ کرے اور اپنی قوت کے سبب باہمی اختلاف کو ختم کردے۔

2۔ بداخلاق لوگوں سے بچانا

بسا اوقات مُعاشرے کے کچھ لوگ مخرّب اخلاق (اخلاق کو بگاڑنے والے) عمل میں گرفتار ہوجاتے ہیں نیز ان پر حیوانی جذبات کا غلبہ جنون کی حد تک طاری ہو جاتا ہے ایسے لوگوں کو سزاؤں اور تنبیہ کی اشد ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ ضروری ہے کہ وہ تمام ذرائع اختیار کئے جائیں جو انہیں ناپاک ارادوں سے باز رکھ سکیں۔ ورنہ قوی اندشیہ ہے کہ آگے چل کر وہ پورے معاشرے کی جڑیں کھوکھلی کردیں گے۔

3۔ استحصال کرنے والے شرپسندوں سے بچانا

معاشرے کا وُجود بالکلیہ ایسے افراد سے پاک نہیں ہوتا جن کا مقصود اجتماعی نظام کی خوبی اور یکجہتی کو درہم برہم کرنا ہوتا ہے یہ لوگ ہر وقت موقع کی تاک اور گھات میں رہتے ہیں اور جہاں اور جب موقع ملے، دوسروں کا مال لوٹ کھسوٹ لیتے ہیں اس چھین جھپٹ اور ڈاکو پن کے پسِ پشت حکومت پر قابض ہو کر اپنے ناجائز حوصلوں کی تکمیل کا مذموم جذبہ کارفرما ہے ایسے بدنیت، ہر قسم کے شرپسند عناصر کو تکمیلِ مقاصد کے لئے اپنا شریک کار بنا لیتے ہیں۔ ایک بہترین سیاسی نظام کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر وقت ایسے فتنہ سامان، شرانگیز، عناصر کے خلاف جہاد کے لئے کمر بستہ رہے۔

4۔ عدل و انصاف کا قیام

انسانی اجتماعی کو بہترین شکل میں قائم رکھنے کے لئے اُمّت کے مفکرین کے پیشِ نظر ہر دور میں ایک نصب العین رہا ہے ان کی تمام تر جدوجہد کا مقصد اس ارفع و اعلیٰ نصب العین کو حاصل کرلینا ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں کہ معاشرے میں عدالت اپنی مکمل ترین شکل میں قائم رہے۔ چنانچہ ایک اچھے سیاسی نظام کے لئے ضروری ہے کہ وہ حصولِ مقصد کے لئے ان مفکرین کے ساتھ مکمل تعاون کرے۔

www.rahimia.org

5۔اخلاقی اقدار کا فروغ

خارجی جھگڑوں اور دنیا کے چکروں میں پھنس کر انسان اپنے اخلاق اور مذہبی تقاضوں کی تکمیل سے غافل ہو جاتا ہے، نیز صحیح دین اور اس کے فرائض یکسر بُھلا بیٹھتا ہے۔اچھے سیاسی نظام کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان فراموش کردہ اخلاقی اقدار اور فرائض منصبی کے احیاء کے لئے رعیت کو وقتاً فوقتاً پند و نصائح کرتا رہے اور اُنہیں خوابِ غفلت سے بیدار کرے۔

ارتفاق چہارم

اس ارتفاق میں مختلف قوموں کے باہمی روابط اور تعلقات پر بحث کی جاتی ہے جب ملکی حدود، دور دراز تک پھیل جاتی ہیں اور انسانی آبادی بڑھ جاتی ہے تو سارا ملک مختلف صوبوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ بعد ازاں ان صوبوں کا نظم و نسق چلاتے ہیں ہر صوبہ اپنی کفالت کے لئے آمدنی کے چند ذرائع رکھتا ہے اور محافظت کے لئے فوج، لیکن افراد کے طبائع میں اختلاف ہوتا رہتا ہے، اس لئے ان میں شر و فساد راہ پا جاتا ہے۔ جذبات کی رو میں وہ صحیح و غلط کا امتیاز قائم نہیں رکھ پاتے اور اکثر غلط راہ پر لگ جاتے ہیں۔آپس کی کشیدگی اور رقابت کے سبب ایک فرد دوسرے کے مال و متاع، زور زمین کو غصب کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے، جب حالات ایسی خطرناک صورت اختیار کرلیں تو ان کو ایک ایسے حاکم کے ماتحت رہنے کی ضرورت پیش آتی ہے جس کے پاس فوج اتنی کثیر اور طاقتور ہو کہ کوئی اس سے مُقابلے کی جُرأت نہ کر سکے جب کبھی ایسا قوی حاکم مل جاتا ہے جو خود بھی صالح نظام کا تابع ہو تو بقیہ تمام طاقتیں اس کے سامنے سَرنگوں ہو جاتی ہے اور اس کی اطاعت گزار بھی۔نتیجتاً افراد کی زندگی مامون اور مسرور ہو جاتی ہے۔

چونکہ کوئی قوم بھی کلیتہً شر پسند عناصر کے وُجود سے خالی نہیں ہوتی اس لئے حاکم کو جنگ و جدل کی ضرورت بھی پیش آتی ہے تاکہ تمدُّنی نظام میں خَلَل اندازی کرنے والوں کو قانون کا پابند کیا جائے اور ان میں سے ان کو بالکل ختم کردیا جائے جن سے آگے چل

کرقوم کو گزند یا آزار (تکالیف) پہنچنے کا اندیشہ ہو، اکثر اوقات حکومت کے مکمل تسلط کے باوجود حاکم کو تلوار اُٹھانی پڑتی ہے۔ کیونکہ درندہ صفت لوگ فتنہ وفساد قتل و غارت گری کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیتے ہیں۔ نتیجتاً ملک سے امن وامان رُخصت ہوتا ہے اور اس پر خوف و ہراس کی ایک عام فضاء طاری ہو جاتی ہے، جنگ کے لئے فوج اور سازوسامان کی ضرورت لازمی ہے، چنانچہ ملک میں فوجی طاقت رہنی چاہئے اور مرکزی خزانہ بھی پُر رہنا چاہئے، تاکہ ہر فتنے کو کچلا جا سکے۔

ایسے حاکم کے لئے ضروری ہے کہ وہ جنگ اور صُلح کے موقعوں کو پہچانتا ہو، اس کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ اپنی بصیرت، آگہی اور موقع شناسی کا اس طرح استعمال کرے کہ مخالفین کی قوت کم سے کم تر ہوجائے اور وہ دوبارہ سر اُٹھانے کے قابل نہ ہوسکیں۔ علاوہ ازیں ان تمام ممالک میں جو اس کے باغی اور دشمن ہیں جاسُوسوں کا ایسا جال پھیلا دے کہ ان کی ہر خُفیہ سرگرمی، اِرادے اور فیصلے سے قبل از وقت ہی آگاہی ہو جائے تاکہ کسی فتنے کے رونما ہونے سے پہلے ہی اس کو ختم کردیا جائے، الغرض اس کا دشمن اس درجے بے بس ہوجانا چاہئے کہ وہ اپنے کمتر اور وفادار ہونے کا ثبوت اپنے قول اور عمل سے پیش کرے، محض زبانی یقین دہانی پر بھروسہ نہ کرلیا جائے بلکہ اُس وقت تک اس سے خبردار رہا جائے جب تک وہ اپنے بےلوث اور مخلص ہونے کا واضح ثبوت اپنے عمل سے نہ پیش کردے۔

باوجود ملکی اور مذہبی اختلافات کے تمام عالم کا اُصولی طور پر ان تمام ارتفاقات پر اتفاق ہے، سبھی ان کی خوبیوں کے مُعترف اور ان کے پابند ہیں، اسے یوں سمجھا جائے ایک انسان کسی غیرآباد علاقے میں پیدا ہوتا ہے چنانچہ وہ رسمی تعلیم سے تو ضرور بے بہرہ رہ جاتا ہے لیکن اس کے باوُجود اسے اپنی بھوک، پیاس، لباس اور جنسی خواہشات کی تکمیل کی ضرورت یقیناً پیش آتی ہے، چنانچہ وہ خوراک ولباس کے علاوہ گرمی وسردی اور بارش کے موسم میں کسی پناہ گاہ کا ضرور محتاج ہوگا، جنسی خواہش اسے مجبور کرے گی کہ وہ اپنی مخالف جنس کے ساتھ اِزدواجی تعلقات قائم کرے نتیجتاً اولاد پیدا ہوگی، اس سے یقیناً اس کی نسل میں اضافہ ہوگا مکانوں کی ضرورت بھی اسی رفتار سے بڑھے گی حتیٰ کہ وہ چھوٹا سا خاندان قبیلے میں تبدیل ہو جائے گا اور آخرکار وہ قبیلہ بھی اضافے، نشوونما اور پھیلاؤ کے

مختلف مراحل طے کرتا ہوا ایک قوم بن جائے گا، آبادی کے اضافے کے باعث آپس میں تعلقات قائم ہوں گے اور لین دین کی نوبت آئے گی اس اجتماعی زندگی کے قیام کے لئے یقیناً پہلے ارتفاق اول اور پھر دوم، سوم اور چہارم کی ضرورت پیش آئے گی اور ایک اچھا خاصا معاشرہ وجود میں آجائے گا۔

آخری ارتفاق میں ملکوں سے مل کر ایک بین الاقوامی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ القصہ حیاتِ انسانی ان چار منازل سے گزرتی ہے پہلی منزل میں انسانی سوسائٹی جانوروں کی زندگی سے قدرے افضل ہوتی ہے، دوسری منزل میں یہ سوسائٹی قابل ذکر طور پر ترقی کرتی ہے، تیسری منزل میں انسان کی ایک قومی زندگی مرتب ہوتی ہے، چوتھی منزل میں قدم رکھتے ہی ایک بین الاقوامی تنظیم وجود میں آجاتی ہے، جسے ہم آج کی اصطلاح میں ''انٹرنیشنل آرگنائزیشن'' کہہ سکتے ہیں۔ یہ تھا ارتفاقات کا باب جس کا ہم نے تعارف کروایا ہے۔ تاہم ارتفاقات کی جس قدر بھی کیفیت بیان کی گئی ہے اس میں مزید تجزیہ اور وضاحت کی گنجائش باقی ہے۔

انسانی ضروریات کی تکمیل کے لئے جب مذکورہ ادارے قائم ہوتے ہیں تو وہ کچھ مدت گزرنے کے بعد مختلف حادثات اور انتشار کا شکار ہو کر کھوکھلے پڑ جاتے ہیں اور ان میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں ان خرابیوں کا ایک بڑا اور اہم سبب مفاد عامہ کو نظر انداز کرنے والے وہ افراد ہوتے ہیں جن کے ہاتھ میں اپنی رہنمائی اور معاشرے کے نظام کی باگ ڈور آجاتی ہے۔ یہ اجتماعی مفاد کو پس پشت ڈال کر اپنی حیوانی اغراض کی تکمیل میں ہمہ تن منہمک اور غرق ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ تہذیب و تمدن کی بنیاد خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ایسے نازک موقع پر معاشرے کو ہلاکت سے بچانے کے لئے فطرت ایسی طاقتور اور باکردار شخصیتیں پیدا کر دیتی ہے جو معاشرے کی از سر نو تطہیر (پاکی) اور تزکیے کا کام سرانجام دیتی ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے معاشرے کو اپنی صحیح منزل کی طرف گامزن کر دیتی ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اکثر مواقع پر اس کی وضاحت فرمائی ہے: کہ انسان کی اخلاقی زندگی کا دارومدار بڑی حد تک اس کی اقتصادی استقامت اور اقتصادی زندگی کے

اچھے نظام پر ہے۔

یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ عیش پرستی اور آرام کے نت نئے سامان تنہا افراطِ زر کا نتیجہ ہیں جب سربراہِ مملکت عیش میں مبتلا ہو جائیں تو ان کی بے راہ روی کے مہلک نتائج غریب عوام کو بھگتنے پڑتے ہیں عیاشی کے سامان کے حصول کے لئے مزدور کسان تاجر اور صنعت کار پر بھاری ٹیکس لگائے جاتے ہیں جن کی ادائیگی کے لئے وہ جانوروں کی طرح دن رات کام کرتے ہیں اتنی مشقت کے بعد بھلا ان کے پاس اتنی مہلت کہاں ہوتی ہے کہ خُدا یا آخرت کو یاد کر سکیں۔ بھوکا اور ننگا انسان نہ اپنی زندگی سنوار سکتا ہے اور نہ آخرت۔

حکام کی نفس پرستی نیز بھاری ٹیکسوں کو عائد کرنے کے علاوہ سوسائٹی کی بربادی کا ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں، کوئی کام نہیں کرتے، نتیجہ سرکاری خزانے کے لئے ایک بوجھ ثابت ہوتے ہیں۔ اب اگر ایک مطمئن زندگی کسی طور پر گزر سکتی ہے تو یوں کہ ٹیکس تھوڑے ہوں اور ملازمین صرف حسبِ ضرورت ہوں۔

علاوہ ازیں تمدُّن کی جڑ ایک اور سبب سے بھی کھوکھلی ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ صحیح پیشہ نہ اختیار کیا جائے مثلاً ایک شخص جو مفلس ہے اور بھوکا بھی، وہ مجبوراً ایسا پیشہ اختیار کرتا ہے، جو اس کی بُنیادی ضرورت کی کفالت پر بھی قادر نہیں، چنانچہ لازمی بات ہے کہ وہ بھیک مانگنے پر مجبور ہو گا۔ اور مجبور بھی ایسا کہ ہر غلط او ذلیل کام کر گزرنے سے بھی نہیں کترائے گا۔ دوسری طرف بعض لوگ باوجود اپنی جسمانی استقامت کے مناسب کمائی کے جائز ذرائع کی طرف راغب نہیں ہوتے بلکہ کم محنت سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے کی فکر میں غلط پیشوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

مُعاشرے کی برائی کے اسباب میں ایک قوی تر سبب یہ بھی ہے کہ آبادی کے تناسُب سے پیداوار کا خیال نہ رکھا جائے، مثال کے طور پر کسی جگہ دس ہزار کی آبادی ہے، لیکن اس آبادی کا اکثر حصہ ملکی پیداوار میں اضافے کی فکر سے خود کو آزاد رکھتا ہے تو اس صورت میں اس آبادی کا فنا ہو جانا باعثِ تعجب نہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ

www.rahimia.org

معاشرے میں تنزّل (زوال) ٹھیک اُس وقت شروع ہو جاتا ہے جب ایک گروہ دوسرے گروہ کی معیشت پر قابض ہونے اور اس کے گزر اوقات کے وسائل محدود کر دینے کے دَرپے ہو جاتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ اجتماعی معاشیات، اجتماعی اخلاق پر قابل ذکر حد تک اثر انداز ہوتی ہے چنانچہ اجتماعی اخلاق کی استقامت اور درستگی کے لئے انسانی اجتماعی میں عادلانہ معاشی نظام کا قائم ہونا ضروری ہے، جب تک ایسا کوئی نظام سماج میں قائم نہیں ہو لیتا اس کے اجتماعی اخلاق کا حُسن پسِ پردہ رہ جائے گا، زندگی کے ایک پہلو کا اس کے دوسرے پہلو سے چولی دامن کا ساتھ رہتا ہے، چنانچہ ایک کی خرابی دوسرے پر یقیناً اثر انداز ہوتی ہے اور یہ معاشی حالات ہی ہیں جو انسانی اخلاق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی رائے میں انسانی اجتماع پورے طور پر مکمل ہو ہی نہیں سکتا البتہ اتنا ضرور ہے کہ اسے تکمیل کے زیادہ سے زیادہ قریب لایا جاسکتا ہے، اجتماع کی مثال جسم کے مختلف اعضاء جیسی ہے، جس طرح ایک شخص مکمل طور پر تندرست نہیں ہوسکتا، اس میں کہیں نہ کہیں کوئی بے اعتدالی ضرور باقی رہ جاتی ہے، یعنہ اس طرح انسانی سماج اپنی صحت میں مکمل اعتدال کا مُدعی ہو ہی نہیں سکتا۔

شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے خیال کے مطابق دراصل یہ انسان کے فطری میلانات ہی ہیں جو معاشرہ اور اجتماعی زندگی کا منبع و مخزن ہے۔ چنانچہ آپ کے خیال میں معاشرے کے کسی مقصد کو متعین کرنے کے لئے انسان کے فطری تقاضوں کی معرفت (پہچان) صحیح طور پر رہنمائی کر سکتی ہے۔ معاشرہ چونکہ انسان کے فطری تقاضوں کا نتیجہ ہے اس لئے اس کا اوّلین اور واحد مقصد یہ قرار پاتا ہے کہ وہ انسانیت اور معاشرہ کے تمام افراد کے فطری تقاضوں کی تکمیل کرے یعنی لوگوں کی بُنیادی ضروریات کے لئے سامان فراہم کرے، مثال کے طور پر کھانا، کپڑا اور جائے قیام۔

شاہ صاحبؒ نے اپنی تصانیف میں اقتصادی حالات کے بہتر بنائے جانے پر کافی زور دیا اور ارتفاقات کے متعلق اس قدر وضاحت اور تفصیل سے اپنے نظریات کو سپردِ قلم کیا ہے کہ اس کے بعد کسی تفصیل اور وضاحت کی گنجائش نہیں رہتی۔ آپ کی تلقین کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنے ہاتھوں سے کچھ نہ کچھ ضرور کمائے اور بڑی حد تک خود

بھی اپنے کھانے پینے کا انتظام کرے۔

حکمتِ الٰہی کا تقاضہ یہ ہے کہ انسانی معاشرہ دوسرے اور تیسرے ارتفاق سے محروم نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ کسی نبی نے ترکِ مُعاشرہ کا حکم نہیں دیا کہ لوگ سماجی رشتوں کو ختم کر کے تنہا کسی جنگل میں ڈیرے ڈال لیں، کیونکہ یہ چیز سراسر انسانی مفاد کے خلاف ہے۔

اکثر اوقات معاشرے کے افراد اپنی منزل کی ابتدائی ضروریات کو نامکمل چھوڑ کر دوسری منزل کی ضروریات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس سے معاشرہ مستحکم (مضبوط) نہیں رہتا۔ لوگوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ کُل جاتا رہے تو جزو کو کم از کم ہاتھ سے نہ جانے دیں! یعنی مثال کے طور پر اگر ارتفاق چہارم ان کی گرفت سے نکل جائے تو وہ لازماً ارتفاقِ سوم کے پابند رہیں، کم از کم اسی سے دستبردار نہ ہوں اس طرح اگر تیسرا رخصت ہو تو دوسرے کی طرف رجوع ہوں، مگر چونکہ لوگوں کو ارتفاق کی مختلف اقسام کا مکمل علم نہیں ہوتا اس لئے وہ ایک ارتفاق پر قائم رہتے ہیں جس کی وجہ سے سوسائٹی میں خلل پڑتا ہے اور معاشرے کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

ضرورتِ انقلاب

جب سوسائٹی میں غیر معمولی خلل واقع ہو، یعنی عام حالات بگڑ جائیں تو انقلاب لانا لازمی ہوجاتا ہے۔ وہ معاشرہ جو اپنے افراد کی بُنیادی ضروریات کو پورا نہ کرے اسے آگ لگ جانا ہی بہتر ہے۔ وہ سوسائٹی اور وہ قوم جس میں درندہ صفت انسانوں کی اکثریت ہو اس کی مثال بعینہٖ اس جسم کی سی ہے جس میں ایک زہریلا پھوڑا موجود ہو کہ اگر بروقت اس کا آپریشن نہ کیا جائے تو یہ یقینی ہے کہ وہ نظام جسم کو درہم برہم کر کے اس کی ہلاکت کا سبب بنے، جو لوگ مفادِ عامہ کے اُصول سے واقف ہیں یہ اُنہیں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسی نازک صورت حال میں سوسائٹی کی بقاء کے لئے اِنقلاب لائیں۔

اِنقلاب گنج عافیت (عافیت کا گھر) نہیں، بلکہ یہ ایک دشوار گزار اور مصائب سے پُر زندگی کا نام ہے، انقلاب کو کامیابی کی حدود تک پہنچانے کے لئے نہ صرف انسان کو جان و مال کی قربانی پیش کرنے کے لئے آمادہ کرنا پڑتا ہے، بلکہ اپنی دل پسند اشیاء اور محبوب وطن

www.rahimia.org

کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے، اس کام کا بیڑہ وہی اُٹھا سکتے ہیں جو بے غرض، مخلص متحمل، دلیر اور خود پر اعتماد رکھتے ہوں۔

اس قسم کے جہاد (انقلاب) میں کبھی دشمن سے سرد جنگ کرنی پڑتی ہے اور کبھی نوبت باقاعدہ لڑائی تک جا پہنچتی ہے، چنانچہ اس کی راہ میں جو کچھ بھی کیا جاتا ہے بہترین اعمال میں شُمار ہوتا ہے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ اسلام دنیا میں ارتفاق چہارم (انٹرنیشنل آرگنائزیشن) کے قیام کے لئے آیا ہے، بالفاظِ دیگر بڑی سے بڑی بین الاقوامی طاقت قائم کرنے کے لئے، چنانچہ یہ مسلمانوں کا فرضِ منصبی ہے کہ وہ مذکورہ ارتفاق کے قیام کے لئے ہر ممکن کوشش کریں۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مُسلّم ہے کہ انٹرنیشنل آرگنائزیشن کا قیام ارتفاق سوم کی تکمیل کے بغیر ممکن نہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان اس کے تصوُّر ہی سے کنارہ کش ہو جائیں اس کا تصوُّر ہمیشہ دل میں رہنا چاہئے اور ہر اُس موقع کی تاک میں رہنا چاہئے جس سے اس تصور کو ٹھوس حقیقت میں تبدیل کیا جا سکے۔

جب تک مسلمانوں کی بین الاقوامی سطح تک کوئی حکومت قائم نہ ہو لے، انہیں چاہئے کہ وہ ارتفاق ثالث کی تکمیل میں لگے رہیں اور خود کو اخلاقی، دینی اور سیاسی اعتبار سے قوی تر بنائیں، جنگ کے لیے ہر وقت کمر بستہ اور چاق و چوبند رہیں، جنگ کے جدید طریقوں سے خود کو پوری طرح آگاہ رکھیں، اور اس ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں جنگ کی رُوح تازہ ہو، حتیٰ کہ وہ خود اس کا مجسمہ بن جائیں؛ یعنی جہاد کا جذبہ ہر وقت اور ہر لمحے مسلمانوں میں موجود رہے۔

شاہ صاحبؒ بھی جس حقیقت کی طرف راہ نُمائی کرنا چاہتے ہیں اس کا خُلاصہ بھی یہی ہے کہ دین حنیف (اسلام) ارتفاق چہارم یعنی بین الاقوامی حکومت کے قیام کے لئے آیا ہے اس کا مکمل غلبہ اُسی وقت ہوگا جب اس کے علاوہ تمام ادیان کو مغلوب کر دیا جائے اور صرف اسلام کی شان و شوکت کو قائم کیا جائے، اس وقت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا انحصار تمام تر دین حنیف پر ہی ہے کیونکہ یہ انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس لئے ہر انسان کو اپنی نیکو کاری اور خُدا پرستی کے سبب اسلام ہی کو قبول کرنا چاہئے کہ اب اس کے

بغیر خُدا کی رضا کا حصول ممکن نہیں اور اس سے رُوگردانی کرنا سراسر معصیت (گُناہ) ہے، بہر کیف قرآن پاک جو انقلاب لانا چاہتا ہے وہ اس آیت میں مضمر ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝

ترجمہ : وہ ذات جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ ،تا کہ غالب کرے وہ اس دین حق کو تمام ادیان پر، اگر چہ مشرکین اس کو بُرا ہی سمجھیں۔ جس کا پہلے بھی کئی بار ذکر آچکا ہے۔

www.rahimia.org

﴿تاریخ اسلام کا اجتماعی نقطۂ نظر﴾

اور قرآن کا انٹرنیشنل انقلاب

بدقسمتی سے ایک طویل زمانہ سے ہمارے اہل علم تاریخ کو انفرادی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں، یہ مرض ہمارے ہاں ظالم بادشاہوں کے دور کی یادگار ہے۔ جبر کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ جماعت کی بجائے فرد پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور تاریخ کے اُتار چڑھاؤ اور واقعات کے تغیر و تبدل کو اجتماعی رویوں کی بجائے چند اشخاص کے کردار پر محمول کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہماری تاریخ کی کتابیں، قوموں کی مجموعی زندگی اور ان کے ارتقاء و زوال پر بحث کرنے کی بجائے بادشاہوں اور ممتاز افراد کے حالات کی کھتونیاں بن گئی ہیں، انفرادیت پسندی کا یہ رجحان ہے جس نے ہمارے اہل علم کو اس طرف ڈال دیا ہے کہ وہ اسلام کی اجتماعی قوت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور ان کا سارا زور افراد کی شخصیتوں کو اُجاگر کرنے میں لگ جاتا ہے۔

تاریخ اسلام کا معروضی مطالعہ

چنانچہ قوموں کی زندگی اور ان کی ترقی میں جماعت کو جو اہمیت حاصل ہے، ہمارے اہل علم اس پر بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ مثال کے طور پر جب وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت لکھنے بیٹھتے ہیں تو مکے کی اجتماعی زندگی، قریش کا قومی نظم و نسق، قصی کے عہد سے قریش کی تنظیم و توسیع کے حالات، جن کا کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور آپ کے مشن سے بہت گہرا تعلق ہے، وہ ان باتوں کو سرے سے پیش نظر نہیں رکھتے، ان کے ہاں نبی اکرم ﷺ کی نبوت اور رسالت پر صرف اس طرح غور کیا جاتا ہے کہ "خدا تعالیٰ کو منظور تھا

کہ ساری نسل انسانی میں ایک مکمل اور برتر انسان پیدا کرے"۔ ہر عالم کے سامنے سیرت نبوی ﷺ کا بس یہ موضوع ہوتا ہے، جسے وہ اپنی علمی استعداد اور مخصوص فکری رجحان کے مطابق پیش کرتا ہے، چنانچہ صرف اس طرز پر ہمارے ہاں بڑی کثرت سے سیرت کی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔

لیکن اس کے برعکس ہم قومی زندگی میں فرد کی بجائے انسانی اجتماع کو اہم مانتے ہیں اور ہم نے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کتابوں میں دیکھا ہے کہ وہ بھی انفرادیت کی بجائے اجتماعیت پر بہت زور دیتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی تعلیم، یورپ کی سیاست کا مطالعہ اور شاہ ولی اللہؒ کا فکر، یہ چیزیں ہیں جنہوں نے ہمیں تاریخ کے واقعات اور حوادث کو اجتماعی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی بنا دیا ہے۔ لیکن یہاں ہم اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اجتماعیت کے لئے لادینیت ضروری نہیں ہے۔

قرآن اور اجتماعیت

اس فیصلے کا میرے افکار پر پہلا اثر ہوا کہ میں نے اسلامی اصولوں کی اجتماعی روح کو قائم رکھنا اپنے لئے ضروری قرار دیا۔ مجھے اس امر کا یقین ہو چکا تھا اور میں نے اس حقیقت کو خوب جان لیا تھا کہ قرآن شریف کو اس طرح سمجھے بغیر اسے دنیا کی اقوام کے سامنے پیش کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ اگر قرآن شریف کی تعلیم کا لب لباب (خلاصہ) اگر صرف یہ ہو کہ "وہ اکمل ترین انسان کے ذریعے نازل ہوئی ہے اور بس، اس لئے ساری دنیا کو یہ پیغام سننا چاہئے" تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہر قوم اپنے بزرگ اور مقتدا (پیشوا) کو اکمل ثابت کرنے کی کوشش کرے گی اور خاص طور پر مسیحی قومیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو برتر ثابت کریں گی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح قرآن کا جو ہمہ گیر مقصد ہے وہ کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔

برعکس اس کے میں اب فرد کی بجائے جماعت پر زور دیتا ہوں اور انفرادیت کے برعکس اجتماعیت کا قائل ہوں۔ میرے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی "دُعاء" کا پہلا نتیجہ تو یہ تھا کہ مکے میں قریش کی اجتماعی حیثیت وجود میں آئی۔ کیوں کہ قریش کا فقط یہ اجتماع ہی دین ابراہیمی کا محافظ اور اس کی اشاعت کرنے

والا بن سکتا تھا، البتہ ضرورت تھی اب ایسے فرد کی جو ان کو دینی تعلیم دے اور ان میں قیادت کی صلاحیت پیدا کرے۔ یہ کام رسول اللہ ﷺ نے انجام دیا۔ اب دنیا کی دوسری اقوام رسول اللہ ﷺ اور آپ کی تعلیمات سے قریش (صحابہ) ہی کے ذریعہ متعارف ہوسکیں، اس لئے آپ کا تعلق باقی دنیا سے قریش کے واسطہ سے ہوا، دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اقوامِ عالم نے اسلام کو رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس کے ذریعہ ہی نہیں جانا تھا بلکہ وہ اس اجتماعی تحریک کی بدولت بھی جس میں قریش پیش پیش تھے۔ اسلام سے واقف ہوئیں، یعنی اسلام کو سمجھنے کے لئے صرف اور صرف رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس پر تمام زور ڈالنے کی بجائے اس اجتماعی تحریک کو بھی سامنے رکھنا چاہئے جو اس ذاتِ اقدس کے اردگرد ظہور پذیر ہوئی تھی، اسلام کو اس طرح سمجھنے سے میرے بہت سے عُقدے (گرہیں) حل ہوگئے۔

سورۂ جمعہ میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے متعلق یہ تصریح کی گئی ہے کہ آپ کے پہلے مخاطب ''اُمیّین'' ہیں۔ اُمیّین سے مراد عرب کے وہ قبیلے ہیں جنہوں نے قریش کی امامت کو تسلیم کرلیا تھا۔ دوسرے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد قرآن عظیم نے اس طرح واضح کیا ہے کہ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (۱۲۸:۲) حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے مل کر دعا کی گئی کہ ہماری نسل سے اُمت مسلمہ پیدا کی جائے اور یہ ''گھر'' یعنی خانہ کعبہ اس کا منبع اور مرکز ہو۔ ظاہر ہے اس اُمت کو ایک نبی کی ضرورت تھی، جو دین ابراہیمی کی صحیح معنوں میں تعلیم دے اور اسے تعلیم و تزکیہ کے ذریعہ اس قابل بنادے کہ وہ ابراہیمی دین، دنیا کی تمام قوموں تک پہنچا سکیں۔ مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اس لئے مبعوث ہوئے تھے کہ وہ قریش کی اصلاح کرسکیں، ان کو تعلیم دیں اور ان کا تزکیہ کر کے ان کو اقوامِ عالم میں اسلام کا نقیب (علمبردار) اور اس کی نشر و اشاعت کا حامل بنائیں۔

قریش کی اجتماعیت

بے شک قریش حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام

کا وطن عراق اور پھر فلسطین تھا لیکن قریشی عربوں کے ساتھ مل کر عرب بن چکے تھے۔ سب سے پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام عرب میں آ کر آباد ہوئے، ان کی اولاد بہت پھیلی اور آگے چل کر ان کے مستقل قبائل بن گئے۔ تورات میں ایک پیش گوئی ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے بارہ سردار ہوں گے۔(1) ہم اس پیش گوئی کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اولادِ اسماعیل کے ذریعہ عرب میں ابراہیمی دین کی اشاعت ہوگی اور آگے چل کر ان کے بارہ سرداروں کی وساطت سے سرزمینِ عرب حنفی ملت کا مرکز بنے گی۔

تورات کی اس پیش گوئی اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا کی تکمیل یوں ہوتی ہے کہ ایک طویل زمانہ گزرنے کے بعد ''قصی'' نام کا ایک سردار قریش کے منتشر قبیلوں کو مکہ معظمہ میں آباد کرتا ہے، وہ ان کی اجتماعی زندگی کو ایک نظم دیتا ہے، ان کے مختلف قبیلوں کو مختلف کام سپرد ہوتے ہیں، ''دار الندوہ'' بنتا ہے، جس میں سب جمع ہو کر اپنے فیصلے کرتے ہیں، حج اور باہر سے آنے والوں کے لئے باقاعدہ انتظام کیا جاتا ہے۔ یہ گویا تمہید ہے خاتم النبیین ﷺ کی بعثت کی۔

قصی بن کلاب کی یہ جماعت اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے سمجھتی تھی اور حضرت ابراہیم محض اسماعیلی عربوں کے جدِ اعلیٰ نہ تھے، بلکہ مسیحی اور موسوی ملتیں بھی ان کو اپنا پیشوا مانتی تھیں۔ اس لئے قصی کی یہ جماعت محض عربوں کی سرداری پر اکتفا کرنا نہیں چاہتی تھی، اس کے بڑے بلند حوصلے تھے، یہ ایک طرف تو عرب قبائل کو اپنے زیرِ اثر لانے کی کوشش میں تھی اور دوسری طرف عراق و شام تک کے علاقوں میں اپنے تجارتی قافلوں کے ذریعہ اثر و رسوخ پیدا کر رہی تھی، اس کے پیش نظر یہ تھا کہ وہ ان سب قوموں کو یکجا کر کے ایک مجمع الاقوام بنائے اور اس کی قیادت اس کے ہاتھ میں ہو۔

اس جماعت میں خاندانی روایات کے طور پر یہ خیال نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا چلا آ رہا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ایک بہت بڑا نبی پیدا ہوگا جو ہمیں تمام اقوام کا سردار بنا دے گا۔ یہی جذبہ بنی اسرائیل میں بھی موجود تھا، چنانچہ اسی بنیاد پر بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل دونوں خاندانوں میں باہمی رقابت بھی تھی، لیکن بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور کسی کو ان کے برابر ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہ

www.rahmania.org

تھا کہ جو کام موسیٰ علیہ السلام نے کیا ان کے نزدیک وہی ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا مصداق تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم تو بنی اسرائیل تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی، نتیجہ یہ نکلا کہ یہودیوں نے ابراہیمی دین کو سب قوموں کا دین بنانے کی بجائے فقط، ایک خاندانی یا زیادہ سے زیادہ ایک قوم کا دین بنا دیا تھا۔

بنی اسرائیل میں سے بے شک مسیح علیہ السلام کی تعلیم غیر اسرائیلی لوگوں تک پہنچی اور ان کے حواریوں نے صابیوں یعنی "آرین" قوموں میں بھی مسیحیت کی اشاعت کی، لیکن ہوا یہ کہ خود بنی اسرائیل نے مسیح علیہ السلام کو ماننے سے انکار کر دیا، چنانچہ یہود اِن کی تعلیم سے بہت کم مستفید ہوئے، عجیب بات یہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت مسیح کا انکار کیا لیکن حضرت مسیح کے ماننے والوں نے یہود کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی کتاب تورات کی سب سے زیادہ اشاعت کی۔

یہودیوں اور عیسائیوں کی ان کوششوں کا اثر قریش کے اہل الرائے بزرگوں پر بھی اثر پڑتا رہا، انہوں نے دیکھا کہ عیسائیوں نے کس طرح بڑی سلطنتیں قائم کر لی ہیں، مگر اس کے ساتھ وہ یہ محسوس کرتے تھے، عیسائی، ابراہیمی دین سے دور ہو گئے ہیں اور حنفی ملت کی قیادت سنبھال نہیں سکے۔ یہودی تو ابراہیمی دین کی اشاعت میں ناکام ہو ہی چکے تھے، اس سلسلہ میں عیسائی بھی زیادہ کامیاب نہ ہوئے، قصی کی اس جدید تنظیم کے بعد قریش مکہ میں یہ حوصلہ پیدا ہو رہا تھا کہ ان میں سے کوئی بڑا آدمی پیدا ہو جو ابراہیمی دین کی دعوت دے اور اس کے قیام کا مرکز بنے۔

قریش کا مکہ میں آباد ہونا اور قصی کے بعد ان میں ایک خاص قسم کی جماعتی زندگی کی ابتداء، اسے میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا کا نتیجہ سمجھتا ہوں، اس دعا کی تکمیل یوں ہی ہو سکتی تھی کہ ایک اُمت ہو جو دنیا کی تمام اُمتوں کی ہدایت کے لئے اُٹھے، پھر اس اُمت کو بھی ایک امام کی ضرورت تھی، جو اسے تعلیم اور تزکیہ کے ذریعہ دنیا میں ابراہیمی دین کی اشاعت کے لئے تیار کرے۔

قریش کے معاملے میں بھی میں ان میں سے کسی خاص گروہ کی خصوصیت اور اس کی امتیاز کا قائل نہیں رہا، ایک حدیث میں آیا ہے کہ "اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَیْشٍ" یعنی "قریش میں

سے امام ہوں گے"، (2) ایک اور روایت میں آیا ہے کہ "بارہ سردار ہوں گے، جو سب کے سب قریش میں سے ہوں گے"۔ (3) اس بیان سے میرا مقصود یہ بتانا ہے کہ یہاں قریش کا بحیثیت مجموعی ذکر کیا گیا ہے۔ قریش میں سے کسی خاص خاندان کو مخصوص نہیں کیا گیا، لیکن بدقسمتی سے ہم نے چیزوں کو اجتماعی طور پر سمجھنا چھوڑ دیا ہے اور انفرادیت کے رجحان نے ہمارے دماغ خراب کر دیئے ہیں۔

یہ اجتماعیت اور اجتماعی فکر ہی کا اثر ہے کہ میں سورۂ بقرہ کی آخری آیت لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے) سے یہ سمجھا ہوں کہ ہمارے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء پر ایمان لائیں۔ ان انبیاء میں ایک فردِ اکمل رسول اللہ ﷺ ہیں، چنانچہ جماعت انبیاء سے مکمل قطع نظر کرنا اور صرف اور صرف رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر غور کرنا میرے نزدیک اب کافی نہیں۔ غلطی یہ ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے شخصی اوصاف میں اس قدر اِنہماک کرتے ہیں کہ آپ کی تربیت یافتہ جماعت کی قدر و قیمت ہماری نظروں سے جاتی رہتی ہے۔ ہمارے اس غلط تخیل کو درست کرنے کے لئے قرآن شریف کا ایک اشارہ کافی ہے۔ سورۂ فتح میں "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" (محمد اللہ کے رسول) کے ساتھ ساتھ "وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ" (اور وہ لوگ جو آپ کے ساتھ ہیں) بھی ارشاد ہوا ہے، یعنی آپ کی تمام کامیابی کو آپ کی جماعت کا کام بتایا گیا ہے، اس کے علاوہ حدیث کی کتابوں میں یک مشہور روایت ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ: "مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر رہے گی" (4) اس کی تفسیر میں رسول اللہ ﷺ کا یہ قول "مَا اَنَا عَلَيْهِ وَ اَصْحَابِيْ" (5) (یعنی جس طریقے پر میں اور میرے اصحاب ہوں گے، اس پر چلنے والی جماعت حق پر ہوگی) نقل کیا گیا ہے۔

ہمارے اس فکر کی تائید اس دعا سے بھی ہوتی ہے، جو قرآن عظیم نے ہمیں سکھائی ہے۔ یہ دعا سورۂ فاتحہ میں مذکور ہے۔ اس میں "صراطِ مستقیم" کی تفسیر صِرَاطَ الَّذِيْنَ سے اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی گئی ہے، یعنی سیدھا راستہ وہ ہے کہ جس کے چلنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا۔ ان کا تعین خود قرآن مجید نے کر دیا ہے، اس کے نزدیک الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی جماعتیں ہیں۔ اس سے زیادہ قرآن مجید کے اجتماعی

تصور کے حق میں اور کیا دلیل ہو سکتی ہے، لیکن معلوم نہیں کیوں ہماری توجہ ادھر نہ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے اجتماعیت سے بے التفاتی برتی اور انفرادیت کی دلدل میں پھنس گئے۔

جامع انسانیت نظریہ

قرآن حکیم کا اجتماعی نقطہ نظر سے مطالعہ کرنے سے میرے دماغ میں دوسرا اثر یہ ہوا کہ میں اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ کتاب دنیا کی تمام اقوام کو ایک انٹرنیشنل انقلاب کی دعوت دیتی ہے اور اس کا مقصود اصلی یہ ہے کہ تمام انسانیت کو ایک نقطہ نظر پر جمع کرے، دوسرے لفظوں میں قرآن کے پیشِ نظر یہ ہے کہ دنیا کے سب دینوں سے اعلیٰ دین، یعنی سب فکروں سے بلند تر فکر یا سب سے بلند بین الاقوامی نظریہ جو ساری انسانیت پر جامع ہو، اس کی طرف لوگوں کو بُلائے اور ان سے اس پر عمل کرائے، انٹرنیشنل انقلاب کا یہ مضمون میں نے قرآن کی آیت:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

سے استنباط کیا ہے۔

ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ ایک زمانے میں ایک قوم ایک مذہب کو اختیار کرتی ہے اور یہ مذہب اس کے قومی افکار و اعمال کا مقدس حصہ بن جاتا ہے، چنانچہ اس طرح دنیا میں ہر قوم کا علیحدہ علیحدہ دین وجود میں آ گیا، اب قرآن تمام انسانیت کے لیے ایک دین پیش کرتا ہے اور اس دین حق کو تمام ادیان پر غالب کرنا قرآن کا مقصد ہے۔ اس کے لیے ظاہر ہے تمام اقوام میں انقلاب پیدا کرنا ضروری ہوگا۔

قرآن کے اس دین حق کو تمام ادیان پر غالب کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی تھیں:

(۱) ایک صورت تو یہ تھی کہ تعلیم و تربیت اور وعظ و ارشاد کے ذریعہ یہ دین تمام ادیان پر غالب آ جاتا اگر یہ چیز اس طرح ممکن ہوتی تو جنگ و جدل یعنی جہاد بالسیف کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ اور تمام قومیں خوشی سے اس دین حق کو قبول کر لیتیں۔

(۲) لیکن مذکورہ بالا آیت کے آخری حصہ میں وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ یعنی مشرکین بیشک بُرا مانیں) کا جملہ بھی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ مشرکین کو یہ ناپسند ہے کہ وہ اس دین حق کا غلبہ دیکھیں، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ ناپسندیدگی اور کراہت اس دین حق کی راہ میں ضرور حائل ہوگی۔ اس لیے ایک ایسی مرکزی طاقت کی لامحالہ ضرورت پڑے گی، جس کے زور سے اس دین کو غالب کیا جائے۔

یہ ہے انقلاب! اور چونکہ اس کا دائرہ ایک ملک یا ایک قوم تک محدود نہیں، بلکہ یہ ساری انسانیت پر جامع، اس لیے یہ انقلاب انٹرنیشنل ہوگا، چنانچہ یہ قرآن دنیا میں اسی انٹرنیشنل انقلاب کا پیغام ہے۔

عام طور پر یہ خیال پھیلایا گیا ہے کہ عدم تشدد کے ذریعے بھی اقوام پر غلبہ حاصل کیا جاسکتا ہے، یعنی انقلاب کے لیے جنگ کرنا ضروری نہیں، چنانچہ عدم تشدد کو اس طرح ماننے والے کہتے ہیں کہ اب جو انقلاب ہوگا وہ اس نئے طریقہ پر ہوگا۔ جبکہ یہ بات واضح ہے کہ اب تک انقلاب کا جو مفہوم لیا جاتا تھا، یہ خیال اس سے بالکل جُدا ہے۔ ہمارے نزدیک انقلاب کی ابتدائی منزل میں ایک حد تک عدم تشدد کا پابند ہونا پڑتا ہے اور ذاتی طور پر ہم ایک محدود زمانے کے لیے عدم تشدد کی پالیسی اپنے لیے معین بھی کر چکے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تاریخ میں بڑی بڑی مقدّس ہستیوں نے عدم تشدد کی پالیسی کو ایک خاص وقت کے لیے ضروری سمجھا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ انسانی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ عدم تشدد کے ذریعہ کام نہیں نکل سکتا، اور کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی مقام پر تشدد کی ضرورت پیش آ ہی جاتی ہے۔

حزب اللہ

اب جبکہ قرآن کا مقصد انٹرنیشنل انقلاب مان لیا گیا تو اس کے لئے تین چیزوں کا تعیُّن ضروری ہے۔

(الف) انٹرنیشنل انقلاب کا ''آئیڈیل'' یعنی نصب العین یا مطمح نظر۔

(ب) انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام۔

(ج) اس پروگرام کو چلانے والی کمیٹی (یعنی جماعت)۔

ہر انقلاب کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی جماعت اس انقلاب کی پشت پناہ (یعنی اسے برپا کرنے والی) ہو، اس انقلابی جماعت کا ایک نہ ایک ''آئیڈیل'' ہوتا ہے اور پھر اس ''نصب العین'' کو حاصل کرنے کے لیے اسے پروگرام بھی بنانا پڑتا ہے۔ ان تین چیزوں کے بغیر کوئی انقلاب برپا نہیں ہوسکتا، چنانچہ اسے ضرورت ہوتی ہے اول ایک ''آئیڈیل'' (نصب العین) کی، دوسرے ایک پروگرام کی، اور تیسرے ایک جماعت کی جو اس پروگرام کو چلائے۔

میرے نزدیک اسلام ایک عالمگیر اور بین الاقوامی انقلاب کی دعوت دیتا ہے۔ اس انقلاب کا ''آئیڈیل'' ہمارے نزدیک قرآن مجید کی یہی آیت (هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝) ہے۔

پروگرام کی وضاحت سے پہلے اس جماعت یا ''حزب'' کا تعین ضروری ہے، جس کے ہاتھوں یہ پروگرام نافذ ہوگا اس ''جماعت'' کا نام قرآن کی زبان میں ''حزبُ اللہ'' ہے۔ حزب اللہ کے فرائض اور مقاصد کے سلسلے میں قرآن عظیم کی مختلف سورتوں میں کافی ہدایات دی گئی ہیں۔ چنانچہ جہاں جہاں ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' وغیرہ سے قرآن میں مؤمنین کو خطاب کیا گیا ہے اور ان کو بتایا گیا ہے کہ وہ کفار اور منافقین کے راستے پر نہ چلیں یا فلاں فلاں حکم کی اس طرح پابندی کریں تو ان تمام احکامات اور بیانات کو ''حزب اللہ'' کا پروگرام سمجھنا چاہئے۔

قرآن نے ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کے عنوان سے جا بجا اسی ''حزبُ اللہ'' کو مخاطب کیا، اور یہ ''حزب اللہ'' مشتمل ہے ان سب افراد پر، مردوں پر، عورتوں پر، عرب اور عجم پر، جو کسی نہ کسی زمانے میں قرآن کے انٹرنیشنل انقلاب کو برسرکار لانا چاہیں گے۔

اس ''حزب اللہ'' کا پہلا نمونہ مہاجرین اور انصار کا گروہ ہے۔ جسے قرآن نے ''السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ'' کا نام دیا ہے اس گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور آپ کے بعد قرآن کے انقلاب کو کامیاب کر کے دکھایا۔

ان کے بعد "حزب اللہ" کا سلسلہ منقطع نہیں ہو جاتا، بلکہ وہ برابر جاری ہے اور رہے گا، ان کے بعد والوں کو قرآن نے "وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ" سے تعبیر کیا ہے، اس میں وہ سب مسلمان قومیں شامل ہیں جو قیامت تک قرآن کے پروگرام کو چلانے کے لیے سرگرم عمل رہیں گی۔ اور یہ قرآنی انقلاب کا دوسرا نمونہ ہے۔

یہ ہے قرآن کے انٹرنیشنل انقلاب کا "آئیڈیل" اس کا "پروگرام" اور "جماعت" کا تعیُّن ہمارے نزدیک مندرجہ بالا آیت "السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ" اس مرکزی کمیٹی یا جماعت کا بہترین تعین ہے۔

❁❁❁❁

حوالہ جات:

(1) مشکوۃ شریف، باب مناقب قریش، ص ۵۵۰، جلد دوم، مطبوعہ محمد سعید اینڈ کمپنی، کراچی۔

(2) مسند احمد (مسند انس ابن مالک) حدیث نمبر ۱۲۴۳۳، حدیث مرفوع ہے۔ ص ۴۷۹، ج ۲۵

(3) مشکوۃ شریف، باب مناقب قریش، ص ۵۵۰، جلد دوم، مطبوعہ محمد سعید اینڈ کمپنی، کراچی۔

(4) مشکوۃ شریف، باب ثواب ہذہ الامۃ، جلد دوم، ص ۵۸۴، مطبوعہ ایضاً۔

(5) ترمذی شریف، باب ماجاء فی افتراق ہذہ الامۃ، حدیث نمبر ۲۵۲۵۔

www.rahimia.org

تاریخ اسلام کا عہد اوّل

سب سے پہلے اسلام کے بارے میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ وہ تمام مذاہب اور فلسفوں کا نعم البدل بن کر آیا تھا، اسلام کے نعم البدل ہونے کی پرکھ ان مذاہب اور فلسفوں نے کر دی۔ چنانچہ جہاں کہیں ان مذاہب اور فلسفوں کی اسلام سے ٹکر ہوئی، اسلام غالب آیا اور یہ مذاہب اور فلسفے یا تو مٹ گئے یا اپنے آپ کو اسلام سے ہم آہنگ بنالیا۔ اسی طرح مشرق قریب میں قدیم تمدّنوں کے بچے کھچے جو بھی آثار تھے وہ یا تو ناپید ہو گئے اور یا وہ نئے اسلامی تمدّن کے جزو بن گئے۔ غرضیکہ اسلام ہزار ہا برسوں کی اس مذہبی جدو جہد کا آخری نقطۂ تکمیل تھا، جو دنیا میں جاری تھی اور مسلمانوں نے جس تمدّن کی بعد میں تشکیل کی وہ تمام مذاہب اور تمدّنی روایات کے اجزائے صالح اور باقیاتِ صالحات کا حاصل تھا۔

قریش کی امتیازی حیثیت

مکہ کے قریش کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ عرب کے دیگر بدو قبائل کی طرح ایک قبیلہ تھا، صحیح نہیں، صحرائی و بدوی زندگی اور اس کے لوازمات و خصائل جو دوسرے بدوی قبائل میں موجود تھے، قریش ان سے بہرہ وَر تو ضرور تھے، لیکن عرب کی بدوی ذہنیت کا نمونہ نہ تھے، قریش کی اپنی خاص روایات تھیں اور قُصَی کے زمانے سے مکہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی میں ایک نظم چلا آتا تھا، نیز تجارتی قافلوں کی وجہ سے قریش کو ہمسایہ ملکوں میں آنے جانے کا موقع ملتا تھا، اور حج وعُکاظ کے میلے کے موقعوں پر عرب قبائل سے بھی ان کے راہ رسم پیدا ہو جاتے تھے۔ یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے قریش ایک طرف مشرق قریب کے تمدّنی سرمایہ اور ذہنی روایات سے واقف تھے اور دوسری طرف قبائل کی بدویانہ

خصائل سے بھی نابلد نہ تھے، چنانچہ قرآن کے بلند معانی اور اعلیٰ مضامین قریش کے لئے اجنبی نہ تھے وہ یہودی اور نصرانی روایات کو بھی سمجھتے تھے اور قرآن میں علم و حکمت کی جو باتیں بیان کی جاتی تھیں ان سے بھی محظوظ ہوتے تھے۔ البتہ ان کے دماغوں میں اپنا کوئی واضح اور مستقل فکر نہ تھا، اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی مادی اغراض میں اس طرح اُلجھے ہوئے تھے کہ وہ اِدھر توجہ نہیں کرتے تھے۔

قریش کا تمدن

قرآن کو عرب کی بدوی ذہنیت کا ترجمان کہنا سخت غلطی ہے، قرآن کا خطاب تو قریش کی ترقی یافتہ سوسائٹی کی طرف تھا، مکہ میں قریش کا اپنا ایک باقاعدہ نظام تھا، تجارتی اور سیاسی معاملات سُلجھانے کے لئے قواعد وضوابط تھے۔ قومیت کا اُن کا اپنا ایک مخصوص تصور تھا اور انہوں نے اس سلسلہ میں ایسی مذہبی رُسوم بنالی تھیں۔ جو ان کے مادی اور اجتماعی مفاد کے لئے مفید تھیں اور اس کی وجہ سے بدو قبائل میں ان کا مذہبی وقار بھی قائم ہوتا تھا اور اس عہد کے ایک محقق کے الفاظ ہیں:

> ''متعدد کاروانی راستوں کا اہم جنکشن ہونے کی وجہ سے یہاں کی آبادی میں یک نسلی نہ تھی، اسماعیلی خاندان عراق یا فلسطین سے آئے تھے، خزاعہ یمن کے تھے، مکہ والوں کی رشتہ داری اور کاروباری تعلقات شہر مدینہ اور طائف سے بھی کافی تھے، قصی کا تعلق شمالی عرب کے قبیلہ قُضاعہ سے تھا، قصی کی کوشش اور قابلیت سے قُریشی قبائل نے شہر مکہ میں سربرآوردہ حیثیت حاصل کی اور قصی ہی کی سرداری میں ایک زیادہ منضبط شہری مملکت قائم ہوئی جس میں سماجی اور انتظامی عہدے موروثی طور پر مختلف خاندانوں میں پائے جاتے تھے۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے حجاز میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم ہونے کے باعث اسلام سے پہلے کسی تحریری مجموعے کا پتہ نہیں چلتا، لیکن قانونِ معاہدہ اور قانونِ جرائم وغیرہ کے بہت سے رواجی احکام روایات نے محفوظ رکھے، حتیٰ کہ اجنبیوں کے حقوق کے تحفظ اور تصادم سے بچنے کے لئے ''حِلف الفضول'' کے نام سے ایک رضا کارانہ نظام تہدید وتدارُک وُجود میں آگیا تھا''۔ (1)

لیکن مکہ کے اس نظام میں چند بُنیادی خامیاں تھیں جن کی بناء پر مکہ کی شہری زندگی

میں اندر ہی اندر ناراضگی کی لہر دوڑ رہی تھی، مکہ میں ایک طرف سرمایہ دار اور تاجروں کا ایک مخصوص طبقہ تھا اور دوسری طرف حبشی غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ مکہ میں سودی کاروبار زوروں پر تھا، امیر طبقہ مال میں مست تھا، تجارت اور سرمائے سے انہیں دولت ملتی اور دولت سے یہ لوگ خدمت کے لئے حبشی غلام خریدتے اور حظِ نفس (نفسانی لذت) کے لئے لونڈیاں لاتے، چنانچہ ناچ اور گانے کی محفلیں جمتیں اور شراب کا دور چلتا، سفر کے سلسلے میں جب ان لوگوں کا ایران اور شام سے گزر ہوتا تو وہاں سے عیش و عشرت کے نئے نئے انداز سیکھ کر آتے، مکہ کا یہ گنا چنا اوپر کا طبقہ اس لہو ولعب میں منہمک تھا، لیکن مکہ کے باشندوں کی اکثریت اقتصادی بدحالی کا شکار ہو رہی تھی۔

دنیا کا مشکل ترین مسئلہ اور اسلام

دُنیا کا سب سے مشکل مسئلہ اور سب سے بڑی گتھی جس کو سلجھانے کے لئے ہمیشہ بڑے آدمیوں کی ضرورت پڑی اور ہر نئے نظام کو اس کے متعلق اپنا خاص نقطۂ نظر متعین کرنا لازمی ہوا، انسانیت کے مختلف طبقوں کے درمیان جن میں اکثر کشمکش رہتی ہے، صلح و صفائی اور میل ملاپ کی راہ پیدا کرنا ہے، امیر وغریب کا فرق، آسودہ حال و قلاش کی چپقلش، زمینداروں اور کسانوں کا تفاوت، زرداروں اور بے زروالوں کی آپس کی کھینچا تانی، کارخانوں کے مالکوں اور ان میں کام کرنے والے مزدوروں کی باہمی بے اعتمادی، اس کشمکش، اس اختلاف اور اس دُشمنی کو جو ایک قوم کے مختلف طبقوں میں قدرتاً ہوتی ہے، دُور کرنا ہر صاحبِ مذہب اور نئے نظام کا فرض ہے، اس لحاظ سے اپنے زمانۂ ظہور میں اسلام کو بھی اِس مسئلہ کا حل کرنا ضروری تھا۔

چنانچہ مذہب اسلام اعلان جنگ تھا، ظالم فاجر، عام مفاد کے ذرائع کے اجارہ داروں کے خلاف جو پسماندہ اور غریبوں کی محنت سے اپنے ہاتھ رنگتے اور مذہب کے نام سے عام عربوں کی سادہ لوحی اور توہمات پرستی سے فائدہ اُٹھاتے تھے، مکہ کے قریشی تاجر نہ صرف غیر قریشی عوام کو ذلیل سمجھتے تھے، بلکہ دولت اور زرداری کے ساتھ ساتھ انہوں نے رنگ و نسب کے عجیب وغریب تصورات بنا رکھے تھے، یہ لوٹ کھسوٹ ہر ذریعے سے رَوا رکھی

جاتی تھی، مذہب ہو یا سیاست، تجارت ہو یا اجتماع، اِن سب کا حاصل یہ ہو گیا تھا کہ قریشی تاجروں کی اس چھوٹی سی جماعت کو اور فروغ ملے۔ قریش کے سربرآوردہ طبقے اگر اِسی رَو میں بہتے چلے جاتے تو ان کا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے سب سے پہلے قریش کی حالت کو سنوارنے کی کوشش کی، قریش اگر راہ راست پر آ جاتے تو ان کے ذریعے عربوں کی اصلاح ہو سکتی تھی اور اگر عربوں جیسی جنگ جُو اور جَری قوم قریش کی قیادت کو مان لیتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام دوسری قوموں تک پہنچ سکتا تھا، بے شک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ اور قرآن کا پیغام سب قوموں کے لئے تھا، لیکن آپ کی بعثت کا پہلا مقصد یہ تھا کہ قریش کی اصلاح و تہذیب ہو جائے تاکہ وہ اس پیغام کو دوسری قوموں تک پہنچانے کا ذریعہ بن سکیں، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں، ایک قومی اور دوسری عالمی و بین الاقوامی، آپ کی قومی حیثیت کا مظہر قریش کی قیادت تھی، آپ کی بعثت کی بین الاقوامیت اور عمومیت کی دلیل یہ ہے کہ اسلام صرف قریش تک محدود نہ رہا۔ ان کے ذریعے عام عربوں تک پہنچا اور پھر دوسری قومیں بھی زُمرۂ اسلام میں داخل ہو گئیں۔

بقول حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ:

> ''جناب رسول اللہ ﷺ میں دو خصوصیتیں جمع ہو گئی تھیں، ایک نبوت اور دوسرے ان کے ذریعے قریش کا برتری اور عزت حاصل کرنا، نبوت ہر قوم اور ہر نوع کے لئے عام تھی، سُرخ اور کالے سب کے لئے، مشعلِ نبوت سے نور حاصل کرنے کے معاملے میں وہ سب برابر تھے''۔ (2)

جب تک بعثتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دو حیثیتیں پیشِ نظر نہ ہوں: اسلام کو صحیح معنوں میں سمجھنا بڑا مشکل ہے، مؤرخوں نے غلطی سے ان دونوں حیثیتوں کو اس طرح گڈمڈ کر دیا ہے کہ بعض دفعہ ان کی باتیں پڑھ کر یہ شُبہ ہونے لگتا ہے کہ ''اسلام خالص

عربوں کے لئے تھا، عربوں نے اسے بلند نام کیا، وہ نہ رہے تو اسلام کو بھی زوال آ گیا اور اب اگر اسلام کی قسمت میں کچھ اچھے دن لکھے ہیں تو اس کی صورت یہی ہے کہ عرب اُٹھیں اور دوبارہ پھر اس میں جان ڈالیں۔ گو عجمی قوموں نے تلوار سے ڈر کر اسلام قبول کر لیا۔ لیکن وہ مسلمان ہوئیں تو اپنے ساتھ الحاد و زندقہ کے جراثیم بھی لیتی آئیں اور ان کی وجہ سے ''حجازی'' اسلام کا صاف اور پاکیزہ چشمہ گدلا ہو گیا''، اس ذہنیت کا یہ نتیجہ تھا کہ صرف عربی زبان کو مقصد مان لیا گیا، عربوں کو سب قوموں سے افضل بتایا گیا اور قرآن کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ممنوع قرار پایا، جب کہ اس وقت ضرورت ہے کہ اسلام اور قرآن کو ان پریشان خیالیوں سے نکالا جائے، بیشک قریش اور عرب کی تاریخی برتری اپنی جگہ مسلم ہے کہ وہ سب سے پہلے اسلام کی عمومی دعوت کا ذریعہ بنے، لیکن جہاں تک بعثت محمدی ﷺ کی عمومیت کا تعلق ہے، سب مسلمان قومیں اس میں مساوی اور یکساں ہیں اور کسی کو دوسرے پر امتیاز نہیں، قریش اور عرب کی یہ برتری استحقاق کی بناء پر تھی۔ اس میں ذات یا نسل کو کوئی دخل نہیں۔ اسلام جتنا حجازی ہے اتنا وہ عجمی بھی ہے اور اتنا ہی ہندی اور ترکی بن سکتا ہے۔

مکی عہد

الغرض بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی قومی حیثیت کی تکمیل تو یوں ہوئی کہ قریش کے ایک ممتاز گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کیا، چنانچہ یہی لوگ نئی تحریک کے چلانے والے بنے، اس گروہ کو اپنے بھائیوں اور عزیزوں سے جو اس نئی تحریک کے مخالف تھے، لڑنا بھی پڑا۔ یہ مکہ کی رجعت پسند طاقت تھی، بارہ تیرہ سال تک مکہ میں ان دونوں جماعتوں میں بڑے زور کی کشمکش رہی، ایک طرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں حضرت ابو بکر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت حمزہ، حضرت سعید اور حضرت مصعب رضوان اللہ علیہم وغیرہم نوجوان تھے اور دوسری طرف خود آپ ﷺ کے حقیقی چچا اور دوسرے عمر رسیدہ سردار ابوجہل، ابولہب، ولید، عتبہ اور ان کے حلقہ بگوش تھے، ان رجعت پسندوں کے ہاتھ میں

اقتدار تھا، وہ اس جماعت کو طرح طرح سے تنگ کرتے تھے، جو حضرت بلالؓ اور حضرت یاسرؓ جیسے لاوارث اور کمزور تھے۔ اُن کو بدنی سزائیں دی جاتیں اور جو قریش کے خاندانوں میں سے تھے، ان کا یہ لوگ مذاق اڑاتے، عام مجلسوں میں ان پر پھبتیاں کستے اور موقع ملتا تو مار پیٹ بھی کر دیتے۔ مسلمانوں کا گروہ تعداد میں کم تھا اور اگر کھلم کھلا لڑائی تک نوبت پہنچ جاتی تو شاید ان کو ہزیمت اُٹھانا پڑتی، لیکن اس کے باوجود عرب میں جہاں کی روایات یہ تھیں کہ ایک شخص ہزار کے مقابلہ میں ڈٹ جاتا اور جان دے دیتا لیکن وہ دوسرے کے ظلم کو برداشت نہ کرتا، خلافِ معمول مکہ کے یہ افراد خاموشی سے قریش کے مظالم سہتے اور حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما جیسے جانباز اور غصہ ور بہادر بھی ہاتھ نہ اُٹھاتے۔

بات یہ کہ انقلاب برپا کرنے کے لئے ہمیشہ ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ جماعت اس وقت تک نہیں بن سکتی جب تک کہ انقلاب کے پیغام کو ان تک نہ پہنچایا جائے، نہ صرف یہ بلکہ وہ اس پیغام کو سمجھیں اور ان کے دلوں میں یہ پیغام رچ بس جائے، وہ اس پر ایک عرصہ تک عمل بھی کریں، اس راہ میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، ان کو برداشت کرنا بھی سیکھیں اور امتحانوں میں پڑ کر جب وہ نکلیں تو اس قابل ہوں کہ انقلاب کے لئے اپنی جانیں دے سکیں۔ تیاری کے دور میں عدمِ تشدد پر عمل کرنا مفید بلکہ ناگزیر ہوتا ہے، چنانچہ تاریخ میں اکثر مقدس ہستیوں نے عدمِ تشدد کی پالیسی پر ایک خاص مدت کے لئے عمل کیا ہے۔

مدنی دور

مکی زندگی کے بارہ تیرہ سال اس انقلابی جماعت کی تربیت میں گزرے، ہجرت کے بعد مدینہ میں یہ جماعت جو مکہ میں انقلاب کی پوری تربیت پا چکی تھی، اپنی حکومت بناتی ہے اور مدینہ کے وہ لوگ جو ان کے ہم خیال ہو چکے تھے اس کے ''انصار'' بنتے ہیں اور مکہ کی رجعت پسند طاقت اس نئی حکومت سے برسرِ نزاع ہوتی ہے تو رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھی انقلاب کو بچانے کے لئے میدانِ رزم میں اُترنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بدر کی جنگ میں اس رجعت پسند طاقت کا زور توڑ دیا جاتا ہے، ایک سال بعد مکہ والے اُحد میں

اپنی گرتی ہوئی طاقت کو سنبھالنے میں قدرے کامیاب ہوتے ہیں، پھر دو سال بعد خندق کا واقعہ پیش آتا ہے۔ اس میں مکہ والوں کے ساتھ عرب کی دوسری رجعت پسند طاقتیں یعنی یہود اور بدو قبائل مل کر مدینہ پر چڑھائی کرتے ہیں، لیکن وہ اس مجموعی طاقت سے بھی انقلاب کے مرکز کو سَر نہیں کر پاتے۔ یہاں سے ان کا زوال شروع ہوتا ہے اور مدینہ کی انقلابی حکومت بتدریج آگے قدم بڑھاتی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو مکہ سے نکلے آٹھ سال ہی ہوئے تھے کہ قریش کی ساری کی ساری جمعیت نے انقلاب کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، مکہ کا فتح ہونا تھا کہ عرب کے دوسرے قبائل بھی جَوق در جَوق مدینہ پہنچنے لگے اور عرب کے اس سرے سے لے کر اُس سرے تک اسلام کا پرچم لہرانے لگا، رسول اللہ ﷺ رحلت فرماتے ہیں تو سارا عرب مدینہ کی نئی حکومت اور اسلام کے نئے نظام کو تسلیم کر چکا ہوتا ہے۔ یہ ہے اسلام کے بین الاقوامی انقلاب کی پہلی منزل۔

قریش کے تصورِ قومیت کی اصلاح

رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات اور فیضِ صحبت سے اب قریش اور ان کے پیرو، یعنی ان کے دوسرے عرب بھائی بند اس قابل ہو گئے تھے کہ وہ اسلام کے پیغام اور اس کی ذمہ داریوں کا بار اُٹھا سکتے۔ ایک لحاظ سے یہ قدم قریش کی قومیت ہی کی اِرتقائی شکل تھی۔ دراصل قریش میں اب تک قومیت کا جو محدود تصور تھا، اسلام نے اسے دوسرے معنی دے دیئے تھے۔ اسلام نے قریش کی قومیت کو، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، مٹایا نہیں، بلکہ اسے بحال رکھا، البتہ اِس کا دائرہ وسیع کر دیا۔ اسلام قومیتوں سے انکار نہیں کرتا، وہ قوموں کے مستقل وُجود کو تسلیم کرتا ہے، لیکن اس میں وہ صالح اور غیر صالح قومیت کا امتیاز کرتا ہے، وہ قومیت جو بین الاقوامیت کے منافی ہو، وہ اس کے نزدیک بے شک مذموم ہے، چلے لیکن یہ کہ قوم کا وجود ہی سرے سے نہ رہے، یہ ناممکن ہے اور نہ فطرت اس کو گوارا کرتی ہے۔ اسلام نے قریش کے محدود قومی تصور کو یوں بدلا تھا کہ اب دوسری قوموں کے اچھے آدمی بھی قریش کی اس اِصلاح شدہ قومیت میں شامل ہو سکتے تھے۔ اسلام سے پہلے قریش کی قومیت صرف مکہ کی چار دیواری تک محدود تھی اور خاص مکہ میں بھی قریش الگ

تھے اور غیر قریشی عناصر جن کی تعداد غالباً قریش سے کچھ کم نہ تھی ، الگ تھے اگر قریش ابولہب اور ابوجہل کے قومی تصور پر چلتے رہتے اور خون اور نسل ہی کو اپنے محدود معنوں میں معیار قومیت مانتے چلتے جاتے تو قریش کا وُجود خطرے میں پڑ جاتا ،اس کے برعکس اسلام نے اس قومی تصور میں اتنی وسعت اور صلاحیت پیدا کردی کہ ایک طرف وہ تصور ساری عرب قوم پر مُشتمل ہو گیا اور دوسری طرف دیگر قوموں کے اچھے افراد بھی اس قومیت کے اِنسانی پہلوؤں کو اپنانے کے لئے تیار ہو گئے ،قریش اس نئی قومیت کے ترجمان اور قائد تھے اور عرب اور دوسرے لوگ ان کے ساتھی اور سپاہی ۔

قریش کا بین الاقوامی کردار

قریش کی قیادت پر دنیا میں مقصدِ بعثتِ محمدی ﷺ کو نافذ العمل کرنے کا بار ڈالا گیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اس بار کا اپنے آپ کو پورا اہل ثابت کر دیا ،چنانچہ ان کے ذریعے ہی چین سے لے کر فرانس تک بسنے والی خُدا کی مخلوق اسلام سے متعارف ہوئی ، اِس سلسلے میں سب سے پہلے قریش آپس میں لڑے اور ان کی انقلابی جماعت نے اپنے رجعت پسند بھائی بندوں کو ٹھکانے لگا دیا ،ہمارے خیال میں ابوجہل ،ابولہب اور اس قبیل کے نامور قریش سرداروں کو رسول اللہ ﷺ کی عظمت و دیانت سے انکار نہ تھا اور سُکون و اطمینان کی گھڑیوں میں وہ آپ ﷺ کو نعوذ باللہ کاذب اور مُفتری بھی نہ کہتے ہوں گے لیکن ان کو اعتراض یہ تھا کہ بلال ایک حبشی زادہ ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' کہنے سے ابوبکرؓ عثمانؓ اور زبیرؓ جیسے اصیل و نجیب قریشیوں کا کس طرح بھائی بن سکتا ہے ۔

رُؤسائے مکہ کی نظروں میں جو چیز ناممکن تھی ،قریش کی اس جماعتؓ نے اسے امر واقعہ کر دکھایا ،ابوجہل و ابولہب کا معیارِ قومیت غلط قرار دیا گیا اور فتح مکہ کے دن قریش کی خاندانی نخوت و نسبی غرور ، جو ان کے لئے حقیقت میں جان کا لاگو بن رہا تھا ،سب خاک میں مل گیا ، کعبہ کی چھت پر بلالؓ کی آواز مکہ کی فضاء میں بلند ہوئی اور قریش کا خون اور نسل کی برتری کا محدود قومی تصور ، جو کعبہ کے تین سو ساٹھ بتوں کے ذریعہ عوام و خاص سے منوایا جاتا تھا ، بتوں کے ساتھ وہ بھی رُخصت ہو گیا ،اور اس کے بجائے ایک نیا قومی تصور

معرضِ وجود میں آیا جس میں جو کوئی بھی قریش کے افکار و خیالات سے متفق ہوتا، بآسانی سما سکتا تھا۔

اسلام کی دعوت "لاقومیت" کی دعوت نہیں تھی، بلکہ اس نے قریش کی قومیت کو ایسی شکل دے دی کہ وہ بین الاقوامیت کو وجود میں لانے کا ذریعہ بن گئی۔ اسلام کا ظہور مکہ میں ہوا جو ذہنی لحاظ سے تو اس وقت کا ایک بین الاقوامی شہر تھا۔ لیکن وہاں کے رہنے والے جسمانی لحاظ سے بدویوں کی سی صحت و توانائی کے مالک تھے مکہ میں اسلام کے اوّلین پیروؤں کی جو جماعت بنی، اس میں ہر قوم کے لوگ شامل تھے، ان میں قریش بھی تھے، بلال حبشی رضی اللہ عنہ جیسے بھی تھے اور صہیب رومی رضی اللہ عنہ بھی تھے، مکہ سے جب یہ جماعت مدینہ میں منتقل ہوئی تو اس میں عبداللہ بن سلام ایسے یہودی عالم اور انصار کے بڑے بڑے سردار بھی شریک ہوگئے، قرآن مجید نے اس جماعت کو "السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" کا نام دیا ہے، اس میں شک نہیں کہ اس جماعت میں قریش کی حیثیت سب میں ممتاز تھی، لیکن یہ امتیاز صلاحیت کی بنا پر تھا، کسی خاندان یا نسب کی وجہ سے نہ تھا۔ درجہ میں سب لوگ برابر تھے، چنانچہ اس عہد کی یہ ایک صحیح انٹرنیشنل جماعت تھی۔

مکہ کے سَر ہونے کے بعد جب قریش کے بچے کھچے عناصر بھی نئی جماعت میں شامل ہوگئے تو یہ جماعت اتنی قوی ہوگئی کہ عرب کی سرزمین میں کوئی عرب یہودی یا عیسائی ان کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکتا تھا، چنانچہ عرب کے تمام قبائل اپنی قبیلہ یا قوم پرستیوں سے تائب ہوکر قریش کی نئی قومیت کا حصہ بن گئے اور سب نے قُریش کی قیادت کو تسلیم کرلیا، حجۃ الوداع میں جو رسول اکرم ﷺ کا آخری حج تھا، ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ سے زیادہ نفوس تھے اور سب کی زبانوں سے "لبیک اللھم لبیک" کی صدائیں بُلند ہورہی تھیں، سب کا ایک خُدا، ایک نبی، ایک قوم اور ایک شاہراہِ زندگی تھی۔

ردِّ انقلاب کی ناکام کوشش

لیکن عرب سے رجعت کے جراثیم ابھی پوری طرح فنا نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے رحلت فرماتے ہی عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ردِّ

انقلاب کا ہنگامہ برپا ہو گیا، چنانچہ مدینہ اور مکہ کی اس جماعت کو دوبارہ عربوں کو بزورِ شمشیر فتح کرنا پڑا اور انہیں قریش کی قیادت ماننے پر مجبور کیا گیا، ارتداد کا طوفان بڑا سخت تھا لیکن انقلابی جماعت کے ایمان اور ہمت سے یہ بلا ٹل گئی، عجیب بات یہ ہے کہ ارتداد کے خلاف جو بڑے بڑے معرکے ہوئے ان میں پیش پیش مکہ کے نوجوان قریشی تھے، جن کو اسلام لائے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ ارتداد حقیقت میں عرب کے بدّو قبائل کی رجعت پسندی کا مظاہرہ تھا۔

قریش میں قیادت کی صلاحیت اور خلافتِ راشدہ

رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ کے تربیت یافتہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کے کام کو جاری رکھتے ہیں۔ یہ ''السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'' کی جماعت تھی، انہوں نے آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ چنا، حضرت ابوبکرؓ کے بعد ان کی رائے سے حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے اور یہی جماعت تھی جنہوں نے باتفاق رائے حضرت عثمانؓ کو حضرت عمرؓ کی جگہ منتخب کیا۔ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے اور اسی جماعت کے غالب حصہ نے حضرت علی کو خلیفہ مانا۔ بے شک اس کی وجہ کوئی خاندانی اعزاز یا نسبی امتیاز نہ تھا جیسا کہ بعد میں غرض مندوں نے سمجھ لیا بلکہ بات یہ تھی کہ مکہ میں اسلام سے بہت پہلے قصی کے زمانہ سے ہی قریش کی ایک ایسی نسل پل رہی تھی جو عرب کی قیادت کی صلاحیت رکھتی تھی، یہ لوگ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کے خاندان میں سے سمجھتے تھے، اپنے مذہب کو دین ابراہیمی مانتے تھے، چونکہ حضرت ابراہیم اسماعیلی عربوں کے مورثِ اعلیٰ تھے اور بنی اسرائیل بھی انہیں کو اپنا بڑا جانتے تھے، نیز غیر اسماعیلی یعنی قحطانی عرب بھی اسماعیلیوں سے گھل مل رہے تھے، اس لئے ان روایات نے قریش کے ذہنوں میں بڑی وسعت کا امکان پیدا کر دیا تھا، دوسری طرف قریش پڑوس کی ترقی یافتہ قوموں اور ان کے مذاہب سے بھی آشنا تھے اور اپنے آپ کو ان سے کسی طرح بھی کم نہ سمجھتے تھے۔ ان کا پھر تجارتی سفروں کی وجہ سے ان ممالک میں آنا جانا بھی تھا نیز مکے میں رہتے ہوئے جو عربوں کا دینی اجتماعی اور ایک حد تک تجارتی مرکز بھی تھا وہ عربوں میں غیر معمولی امتیاز حاصل کر چکے تھے، ان داخلی اور

خارجی اسباب کی بنا پر قریش میں سے آئمہ (لیڈرز) کا ہونا ایک قدرتی اَمر تھا، چنانچہ سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر نے قریش میں سے ہی امیر کو چننے کے حق میں جہاں اور دلیلیں دی تھیں اس سلسلے میں یہ بھی فرمایا تھا کہ عرب قریش کے سوا کسی اور کی امارت کو قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوں گے۔

مختصراً اسی طرح قریش کا عرب کی قیادت کی سعادت حاصل کرنا بعثت محمدی ﷺ کا ایک لازمی نتیجہ بن گیا۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے فوراً بعد ہی سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار و قریش صحابہ کی طرف سے بحث و مناظرہ ہوا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انصار نے قریش کی قیادت و امارت کے اصول کو تسلیم کرلیا تاہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ ہم (قریش) انقلاب کی قیادت کریں گے اور تم (انصار) ہمارے دست وبازو (وزیر) ہوں گے۔

اور حضرت ابوبکرؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جس حدیث "اَلْاَئِمَّۃُ مِنَ الْقُرَیْش" کے حوالہ سے قریش کی امارت کے حق میں جو دلیل دی تھی بعد میں تاریخی واقعات نے بھی ان کے اس دعوے کی تصدیق کردی۔ چنانچہ عربوں کی جہاں کہیں حکومتیں بنیں، قریش کے خاندان کے لوگ ہی ان میں برسرِ اقتدار آئے، اُمویوں کے وارث عباسی بنے، اسپین میں جو عربی سلطنت قائم ہوئی، اس کے فرمانروا اُموی تھے، اور مصر میں قریش ہی کی فاطمی شاخ اپنی خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اُمویوں، عباسیوں اور فاطمیوں کا دور ختم ہوا تو عرب بھی مسند اقتدار سے برطرف کر دیئے گئے اور ان کی جگہ مسلمانوں کی دوسری قوموں نے لے لی۔

حوالہ جات:

(1) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی، از ڈاکٹر حمید اللہ
(2) تفہیمات، جلد اول، (عربی)، ص ۲۶۹، مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدر آباد

﴿تاریخ اسلام میں قومی حکومتوں کا دور﴾

جماعتِ صحابہؓ میں اختلافِ رائے

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری زمانہ تک مرکزی جماعت کا اتفاق قائم رہا، اس عہد میں صحابہ کی دو جماعتیں بن گئیں، ایک جماعت سمجھتی تھی کہ اگر حاصل شدہ سلطنت کے استحکام کی طرف توجہ نہ کی گئی تو سلطنت میں بڑا انتشار پیدا ہو جائے گا، پھر ایک طرف بدو عرب بھی بے قابو ہو رہے تھے، اور دوسری طرف مفتوحہ اقوام ہنوز پوری طرح مطیع نہ ہوئی تھیں۔ اس جماعت کا کہنا یہ تھا کہ اتنی وسیع سلطنت کو سنبھالنے کے لئے عربوں کو بحیثیت ایک قوم کے آگے بڑھنا چاہئے۔ اس کے خلاف دوسری جماعت عربیت کو مؤخر اور ابتدائی زمانہ کی اسلامیت کو مقدم رکھنا چاہتی تھی، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری سالوں میں یہ کشمکش زوروں پر رہی، مرکزی جماعت کے اس اختلاف سے عربوں کے شورش پسند طبقوں نے فائدہ اُٹھایا اور حضرت عثمان شہید کر دیئے گئے۔ ان شورش پسند عربوں کے سامنے کوئی نصب العین نہ تھا، یہ دراصل بدوؤں کی پُرانی نراجی ذہنیت کا مظاہرہ تھا۔

بے شک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیش نظر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے عہد کو تازہ کرنا تھا، لیکن ان کو کوفہ اور بصرہ میں جن لوگوں سے سابقہ پڑا وہ عہد اول کی بلند نظری تو کجا، عربی تنظیم سے بھی بے بہرہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بلند نصب العین واقعی قابل تعریف تھا، لیکن جن لوگوں کے ذریعہ وہ اس نصب العین کو عمل میں لانا چاہتے تھے، وہ بین الاقوامی تنظیم تو کیا قومی تنظیم سے بھی ناواقف تھے، ان کے بر خلاف امیر معاویہ رضی اللہ عنہ عربوں کو بحیثیت ایک قوم کے منظم کر کے اسلام کا محافظ بنانا چاہتے تھے،

چنانچہ انہوں نے شام والوں کو عربیت کے نام سے جمع کیا، نصب العین تو ان کا بھی اسلام رہا لیکن ان کا یہ نصب العین عرب قوم کا قومی مسئلہ بن گیا۔

باہمی جنگ و جدال کی حقیقت

ہمارے نزدیک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری زمانے اور حضرت علیؓ کی خلافت کے دور میں مسلمانوں میں جو خانہ جنگیاں ہوئیں، اُنہیں یہ سمجھنا کہ وہ محض ایک یہودی مفسد یا چند بدطینت منافقوں کی سازشوں کا نتیجہ تھا، ٹھیک نہیں۔ خود ہی انصاف فرمایئے کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کا نظام سب سے برتر و اعلیٰ ہے اور جن بزرگوں نے اس نظام کو عملی شکل دی، وہ دنیا کے بہترین لوگ تھے۔

اگر یہ صحیح ہے اور ہم مانتے ہیں کہ یہ بالکل صحیح اور درست ہے تو کیسے ممکن تھا کہ ایک یہودی یا چند نابکار اس نظام کو آسانی سے درہم برہم کر دیتے، اگر بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے تو لامحالہ یہ کہنا پڑے گا کہ اسلام کا نظام اور اس کے اولین کارفرما نعوذ باللہ اتنی صلاحیت بھی نہ رکھتے تھے کہ ان کا لگایا ہوا پودا ایک معمولی سے جھٹکے کا مقابلہ کر سکتا، کسی نظام کی برتری اور اس کے نافذ کرنے والوں کی عظمت کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ نظام نافذ کرنے والوں کے بعد بھی قائم رہے اور نہ صرف قائم رہے بلکہ اور ترقی کرتا جائے، ورنہ تاریخ میں بارہا یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی قوم میں کوئی غیر معمولی شخصیت پیدا ہوئی اور اس نے ایک مختصر سی مدت میں قوم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا، لیکن جوں ہی وہ شخصیت دنیا سے رُخصت ہوئی، اس کے ساتھ اس کی حاصل کی ہوئی عظمت بھی ختم ہو گئی۔

خُدا نہ کرے اگر تاریخ اسلام کے ان نظریات کو مان لیا جائے جو آئے دن ہمارے بڑے بڑے ''اربابِ علم و فضل'' پیش کرتے ہیں اور اپنے ان نظریات کی بناء پر دنیا سے یہ حُسنِ ظن رکھتے ہیں کہ وہ ان کے نظام کو سب نظاموں سے افضل اور مفید تر مان لے گی، جو بقول ان کے صرف تیس برس تک ٹھیک طرح چلا اور جس کے ان تیس برسوں کے بھی آخری دس سال آپس کی لڑائیوں اور خونریزیوں میں گزرے۔

درحقیقت خانہ جنگی ہر انقلاب کا ایک لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ انقلاب

کے ہنگامے میں (عوام کی شمولیت کے بعد) ہر مزاج اور ہر رُجحان کے آدمی باہم مل جاتے ہیں، ان (عوام) کا یہ اتحاد داخلی سے زیادہ خارجی اسباب کی بناء پر ہوتا ہے، انہیں چونکہ مخالف طاقتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور مثل مشہور ہے کہ دوسروں کی دشمنی اور عداوت ناہم جنسوں کو بھی اکٹھا کر دیتی ہے۔ چنانچہ ہر خیال کے آدمی جن کا نصب العین انقلاب برپا کرنا ہوتا ہے، اس جماعت میں شریک ہو جاتے ہیں۔ انقلاب کی کشمکش میں جہاں ہر آدمی کو مرنے مارنے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا، طبیعتوں کے یہ اختلافات اُبھرنے نہیں پاتے اور جماعت میں یکجہتی قائم رہتی ہے، لیکن جونہی مخالف قوتیں ختم ہوجاتی ہیں اور سامنے کوئی فوری اور سخت خطرہ نہیں رہتا تو پھر دبے ہوئے جذبات اُبھرتے ہیں شروع شروع میں نظری اختلافات ہوتے ہیں پھر ہر خیال کا ایک گروہ بن جاتا ہے اور آخری نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ خود انقلابی جماعت آپس میں پھٹ جاتی ہے اور دوسروں سے لڑنے کی بجائے یہ باہم دگر لڑنے لگ جاتے ہیں۔ دنیا میں جہاں بھی انقلاب برپا ہوا ہمیشہ ہنگامہ انقلاب کے سرد پڑتے ہی وہاں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ لیکن یہ خانہ جنگی انتشار یا زوال کی علامت نہیں ہوتی بلکہ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ایک کام کرنے کے متعلق مختلف رائیں ہوجاتی ہیں، اب اگر ہر ایک رائے کو مان لیا جائے تو جماعت کا شیرازہ بکھر جائے گا، اس لئے ضرورت پڑتی ہے کہ ایک رائے والے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالیں، لیکن دوسرا فریق بھی اپنی رائے کو صحیح سمجھتا ہے اور دوسرے کی دلیل و منطق سے وہ قائل نہیں ہوتا، اس لئے لازمی طور پر تلوار سے معاملہ کو نبٹانا پڑتا ہے۔

پارلیمنٹری نظام میں یہ جھگڑا عام انتخاب کے ذریعہ طے ہوجاتا ہے، اور تلواروں کی بجائے ووٹوں سے جمہور فیصلہ کر دیتے ہیں کہ کونسا فریق برسر اقتدار ہو۔ ہارنے والی جماعت اس فیصلے کو تسلیم کر لیتی ہے، لیکن غالب فریق شکست خوردہ جماعت کو خارج از بحث نہیں کر دیتا بلکہ اس کو شریک حکومت بناتا ہے، اس سے مشورے لیتا ہے، اور بعض دفعہ اگر ان کا مشورہ صحیح سمجھے تو اسے قبول بھی کر لیتا ہے۔ ہارنے والی جماعت غالب فریق کی حکومت صرف اس لئے تسلیم کر لیتی ہے کہ اسے یہ اُمید ہوتی ہے سال، دوسال یا پانچ سال کے بعد ہم پھر جمہور سے استصوابِ رائے کر سکتے ہیں اور کچھ بعید نہیں کہ اب کے ہم

غالب آئیں۔ لیکن یاد رہے کہ پارلیمنٹری نظام صرف امن و امان اور عام حالات ہی میں چل سکتا ہے، اس کے برعکس کسی انقلاب کا ہونا خود اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ملک کے حالات غیر معمولی تھے، اس لئے باتوں اور رائیوں کی بجائے تلواروں سے کام لینا پڑا۔

اس سے کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ انقلابی طبعاً خون آشام ہوتے ہیں آپ کو سُن کر تعجب ہوگا کہ وہ لوگ جن کو اپنی دعوتِ انقلاب کے سلسلہ میں تلوار چلانی پڑی ان میں اکثر ایسے تھے جو بڑے رقیق القلب (نرم دل) تھے وہ بچوں کے ساتھ ہوتے تو بالکل معصوم بچے بن جاتے۔ وہ طبیعت کے بے حد نرم اور مزاج کے بڑے ٹھنڈے تھے، لیکن ہوا یہ کہ ان کے زمانے کے لوگ دلیل کی بجائے محض تلوار کو حَکَم اور پنچ مانتے تھے، چنانچہ ان بزرگوں کو مجبوراً تلوار بے نیام کرنی پڑی اور جب انقلاب میں تلوار ہی حَکَم ٹھہری تو ظاہر ہے کہ انقلاب کے بعد خود انقلابی جماعت میں جو اختلاف ہوگا، اس کا فیصلہ بھی تلوار سے کیا جائے گا، حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت امیر معاویہؓ اور اس عہد کی دوسری لڑائیاں دراصل دو رائیوں کا تصادم تھا۔ عام حالات ہوتے تو دونوں جماعتوں میں ووٹوں کے ذریعے فیصلہ ہو جاتا لیکن وہ زمانہ اور تھا، ہر شخص شمشیر بند تھا، اس لئے اس کی رائے کا اظہار شمشیر ہی سے ہوتا تھا۔

بے شک رسول اللہ ﷺ کے بڑے ممتاز اور قریبی صحابہؓ میں تلوار چلی، اسلام کے مخالف اس پر ہنستے ہیں اور جو مسلمان ہیں وہ اس کی عجیب عجیب تاویلیں کرتے ہیں، اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کی پیشینگوئیاں بیان کرتے ہیں۔ دبی زبان میں کچھ کہتے، تو بعد میں جو بات کہی تھی اُسے اَن کہی بنانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اگر اسلام کو ایک انقلابی تحریک کی نظر سے دیکھا جائے تو سارے معاملات واضح ہوجاتے ہیں اور کسی کو بُرا بھلا کہنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ اور دل میں کُچھ اَور، اور زبان و قلم سے کچھ اَور کہنے اور لکھنے کی بھی حاجت نہیں رہتی۔

ایران، شام اور مصر کو فتح کرنے اور کسریٰ کو ختم اور قیصر کو ایشیائی مملکت سے محروم کرنے کے بعد عربوں کا انقلابی جوش قدرے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اب حالت یہ تھی کہ ایک بدو مدینہ سے اونٹ پر سوار ہوتا تو اسلامی سلطنت کی آخری حد تک پہنچتے پہنچتے اِس کا دَم ختم

www.rahimia.org

ہو جاتا، پہلے عرب اپنے آپ کو مخالف قوتوں میں گھرا ہوا پاتے تھے اور ہر طرف ان کے ایسے دشمن بھی موجود تھے جن کا سَر کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ قدرتی طور پر اس زمانے میں ان کی طبیعتوں کا انقلابی رُجحان پورے عُروج پر تھا، لیکن جب انہیں اتنی بڑی سلطنت مل گئی اور ان کے سامنے کوئی فوری خطرہ بھی نہ رہا تو ظاہر ہے کہ اس جوش و خروش میں کمی آ گئی، اگر عربوں میں واقعی اس وقت انقلاب کا پہلا سا زور ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے اولوالعزم خلیفہ کو نامساعد حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

عربوں کی قومی حکومت اور بنو اُمیہ کا عروج

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے ساتھ "السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" کا دورِ اقتدار ختم ہوتا ہے۔ اور اسلام کی بین الاقوامی تحریک کو چلانے والی اس وقت کوئی جماعت موجود نہ تھی، جو سب قوموں کی نمائندہ ہوتی، بلکہ اس وقت تک عربوں کے سوا کسی دوسری قوم نے بحیثیت مجموعی اسلام کو قبول بھی نہ کیا تھا تو ان حالات میں یقیناً عرب ہی اس تحریک کے محافظ اور علمبردار بن سکتے تھے، اس دور میں اسلام کی بین الاقوامی تحریک عام عربوں کے لئے بین الاقوامی تحریک بن گئی اور اس کی حفاظت اور بقاء ان کی قوم کی موت و زندگی کا سوال ہو گیا۔ اور لامحالہ اس کا اثر حکومت کی رائے پر بھی پڑا، گو اسلام کی بین الاقوامیت اپنی جگہ بدستور قائم رہی لیکن عملاً عربوں نے آہستہ آہستہ بین الاقوامیت کو اپنے قومی دائروں میں لے لیا کیوں کہ اس وقت اس کے بقا کی صرف یہی ایک صورت ممکن تھی، اگر عرب اس کو اپنا قومی مسئلہ نہ بنا لیتے تو اسلام کی بین الاقوامیت مختلف عناصر کی کھینچا تانی کے ہاتھوں کبھی منڈے نہ چڑھ سکتی۔ اور اب عربوں کی قومی حکومت شروع ہوتی ہے۔

جب اسلام کی تحریک کی حفاظت عربوں نے اپنا قومی مسئلہ بنا لیا، تو ظاہر ہے کہ اسلام سے پہلے قریش کے جس خاندان کے ہاتھ میں اقتدار تھا وہ برسرِ عروج ہوتا، یہی وجہ ہے کہ عربوں کی قومی حکومت کی قیادت بنوامیہ کو ملی، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حکومت مسلمان عربوں کی قومی حکومت کا بہترین نمونہ تھی اور اس میں شک نہیں کہ وہ مسلمان عربوں کے بہت بڑے آدمی تھے۔

عام عربوں کا رُجحان بنو ہاشم کے مقابلہ میں اُمویوں کی طرف زیادہ تھا اور اس کے اپنے اسباب ہیں۔ علوی، خاندان رسالت میں ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے عربوں سے ممتاز سمجھتے تھے، خلافت راشدہ کے بعد امویوں کا برسر اقتدار آنا حقیقت میں اسلامی اصولوں سے کسی قسم کی بغاوت نہ تھی۔ بلکہ اموی دور اسلام کی بین الاقوامی تحریک کے ارتقاء کی ایک لازمی کڑی کا حکم رکھتا ہے، ہمارے تاریخ نگاروں نے بنوامیہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور بنوامیہ کے سیاسی مخالفوں نے بھی جو بعد میں ان کے تخت و تاج کے وارث بنے، انہیں بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، پہلے ہم بھی بنوامیہ کے خلاف اپنے مورخوں کی باتیں پڑھ کر متاثر ہو جاتے تھے، لیکن اب جو ہم نے دنیا کی انقلابی تحریکوں کو بغور مطالعہ کیا اور ایک انقلابی تحریک کو جن جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ان کو جانا تو ہم پر اموی دور کی اصل حقیقت واضح ہوگئی۔ جس زمانہ میں بنو اُمیہ کے خلفاء سلطنتوں کے مالک ہوئے اس زمانہ میں بادشاہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو مسئولیت سے بالا سمجھتے تھے، لیکن یہ عدم مسئولیت صرف شخصی اور نجی زندگی تک محدود ہوتی۔ جہاں تک قوم اور ملک پر حکومت کا تعلق تھا اس کے لئے ایک معین دستور اور قانون تھا اور جو بادشاہ یا فرمانروا اس مسلمہ دستور کی خلاف ورزی کرتا، اس کی سلطنت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکتی، بدقسمتی سے ہمارے تاریخ نگاروں نے فرمانرواؤں کے ذاتی حالات اور خانگی زندگی کے واقعات کو تاریخ میں ضرورت سے زیادہ اہمیت دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ کی صحیح حیثیت ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

جب کوئی قوم انقلاب کی اس منزل پر پہنچتی ہے تو اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ نئے حالات کے مطابق اپنے لائحہ عمل کو نیا رنگ دے۔ شروع شروع میں قوم کے سارے کے سارے فرد انقلاب کے سپاہی ہوتے ہیں اور اگر کسی سبب سے حرب و ضرب کا سلسلہ رُک جائے تو اُن میں آپس میں لڑائیاں چھڑ جاتی ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آخری زمانہ میں یہی ہوا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو سمجھا اور انہوں نے اس انقلاب کو قومی شکل دے دی۔ اور عرب بحیثیت قوم کے اس کے حامل و محافظ بن گئے۔ چنانچہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دمشق کو پایۂ تخت بنایا اور

اپنا بیڑہ (جو سترہ سو جہازوں پر مشتمل تھا) تیار کیا اور عربوں کو نئی فتوحات کی طرف متوجہ کر دیا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اِس سیاست اور دانش مندی کا نتیجہ تھا کہ وہ عرب جو آپس میں لڑلڑ کر فنا ہو رہے تھے، پھر متحد و متفق ہو گئے اور خشکی و تری میں اُن کی فوجیں اور آگے بڑھتی چلی گئیں۔

ہم نے بنواُمیہ کی غلطیوں کو تو خوب اُچھالا، لیکن اُن کی حکومت کی جو اچھائیاں تھیں، ان کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیا۔ بیشک اُمویوں نے اسلامی حکومت کو قومی اور عربی رنگ دیا، لیکن انہوں نے اسلام کے بین الاقوامی فکر کو اپنی قومی حکومت کے تابع نہ بنایا۔ چنانچہ عہدِ اُموی میں اسلام کا سیاسی مرکز دمشق تھا لیکن ذہنی اور علمی مرکز مدینہ ہی رہا۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی فکر کی بین الاقوامیت بحال رہی، الغرض اُموی حکومت کی سیاست تو بیشک عربی امتیاز کو لئے ہوئے تھی لیکن اس سیاست سے جو علمی نتائج مرتب ہوئے وہ مفتوح کے حق میں بے حد مفید تھے۔ عربی فتوحات نے مفتوحہ ملکوں کے اوپر کے طبقے کو، جن کے بار تلے ان کے عوام بری طرح کچلے جا رہے تھے، ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا، نیز جہاں جہاں عرب فاتح گئے اس کے ساتھ اسلام گیا، فتوحات کا سیلاب تو آیا اور گزر گیا، لیکن اسلام کے عقائد جس جس سرزمین پر پہنچے وہاں لوگوں کی ذہنی اور جماعتی زندگیوں کو بدلتے چلے گئے، پہلے کے مذاہب جو بے جان اور بے روح کھلونے بن چکے تھے، اسلام کے فکری طوفان کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے، پرانی دنیا اپنی تمام تر فرسودگیوں کے ساتھ رخصت ہوئی اور تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

اسلام نے اس وقت کی دنیا کو کیسا پایا تھا اور اس کی کیا کایا پلٹ کردی۔ اسلام کے اس زریں کارنامے کی صدائے بازگشت غیر مسلم مؤرخین کی زبانی سُنیے۔ ایم این رائے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ”اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں وہ ایک آواز تھی، جس نے عرب قبائل کو متحد کر دیا، کچھ ہی عرصہ بعد اس سیاسی اور مذہبی مرکزیت کے جھنڈے تلے سلطنت روما کے وہ تمام ایشیائی وافریقی صوبے آگئے، جو قدیم متزلزل نظام سے نکلنا چاہتے تھے، عیسائیت میں نہ تو اگلا سا جوش تھا اور نہ اس کی انقلابی اہمیت ہی باقی تھی، وہ اپنے کمزور کندھوں پر

خانقاہیت (رہبانیت) کا بوجھ لئے کانپ رہی تھی، ایسے نازک وقت میں عربستان سے اُمید کی کرن پھوٹی، اسلام کی تلوار بظاہر خدا کی خدمت کے لئے بلند ہوئی، لیکن در حقیقت اس نے ایک ایسے ترقی پسند سماجی اور مذہبی نظام کا سنگ بنیاد رکھا جس نے تمام فرسودہ خیالی، توہم پرستی اور (بیکار) قدیم مذاہب کو موت کی گہری نیند سلا دیا"۔(1)

اسلام کی اس انقلاب آفرینی کا ذکر کرتے ہوئے فرانس کا مشہور اجتماعی مصنف موسیو لیبان لکھتا ہے:

"اسلامی تہذیب کی تاریخ میں یہ نہایت اہم واقعہ ہے اور اس زمانہ کی عربی تہذیب کے اثر اور اس کی اہمیت کا غالباً سب سے اہم اور قطعی ثبوت بھی اِیرانی، بازنطینی اور قبطی سب ایک لاعلاج کاہلی کا شکار ہو رہے تھے، اور اس قابل نہ تھے کہ از خود زمانے کی ترقی کا ساتھ دے سکیں۔عربوں سے ربط وضبط پیدا ہونے ہونے کی وجہ سے ان کی سُستی دور ہوگئی اور ان میں ایک نئی طرح کی ذہنی بیداری پیدا ہوگئی"۔(2)

بدقسمتی سے ہماری تاریخ نے تیغ آزماؤں کے کارناموں پر بہت زور دیا یا حکمراں طبقوں کی غلط کاریوں اور کوتاہیوں کو اُچھالنے کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ رکھی، لیکن اسلامی انقلاب سے جو شاندار اور دور رس نتائج برآمد ہوئے، ان کی تحقیق نہ کی، اُموی فتوحات کی وجہ سے ہی ایسے حالات پیدا ہو سکتے کہ پس ماندہ انسانیت کو نئی زندگی سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ملا۔اس وقت ممالک فارس وروما کے کھنڈر صاف کرنے کی ضرورت تھے تاکہ ایک نیا سماجی نظام، نئے خیالات اور مقاصد کی شمع لے کر اُٹھے اور تاریک دُنیا میں علم کا نور پھیلا دے۔مجوسی تصوف کے گندے توہمات اور یونانی کلیسا کے ناگفتہ بہ ماحول نے فارس اور روم کے ممالک کے عوام کو ذہنی پستی اور اخلاقی کمزوریوں کے قعر مذلت میں پھینک دیا تھا۔

بنواُمیہ کی عربی حکومت نے ایک تو ممالک فارس و روم کے کھنڈرات صاف کرنے کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا، دوسرے اپنی فتوحات سے اسلام کے بین الاقوامی پیغام کو عام بھی کیا، اس طرح مفتوحہ ممالک کی قومیں اسلام سے متعارف ہوئیں، اور ان کا اثر یہ ہوا کہ یہی قومیں ایک صدی کے اندر اندر اس قابل ہوگئیں کہ عرب ان کو اپنے ساتھ حکومت میں برابر کا شریک بنانے پر مجبور ہوگئے۔موسیو لیبان کے الفاظ میں :

"خون ریزی کے اس گرداب میں نئے تمدن کا بیج جو ایک قدیم سرزمین میں دیا گیا، از سرِ نو پھوٹتا ہے اور جب طوفان تھم جاتا ہے تو اُمویوں کا ستارہ غروب ہوتا ہے اور عباسیوں کے کوکب اقبال کی درخشانی سے اُفق روشن ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں عظمت و جلال کے ایک شاندار منظر سے دوچار ہوتی ہیں"۔(3)

عباسی دور اور نیم آزاد سلطنتیں

اسلام کے عالمگیر انقلاب کی دوسری منزل یہاں ختم ہوتی ہے اور عباسیوں سے اس کے تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ پہلے دور میں قریش سارے عرب کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرتے ہیں، دوسرے دور میں قریش اور عرب مل کر دنیا کے ایک وسیع رقبے کو اسلام کے زیر اثر لے آتے ہیں، گو عہدِ اُموی میں حکمران طبقوں میں عربی رنگ غالب تھا، لیکن اہل علم اسلام کی عمومی حیثیت کی بڑی شد و مد سے اشاعت کرتے رہے، چنانچہ اس عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ غیر عرب مسلمان بھی حکومت میں مساوی حیثیت کا مطالبہ کرنے لگے، اُموی عرب پہلے کی طرح قومیت کو ہی اشاعت اسلام کا ذریعہ سمجھتے تھے، ان کو یہ احساس نہ تھا کہ ایک صدی میں کتنی اور قومیں مسلمان ہو چکی ہیں، اور اب ان کے وجود کا انکار کر کے کوئی سلطنت قائم نہیں رہ سکتی، عباسیوں نے بدلتے ہوئے زمانے کی اس ضرورت کو سمجھ لیا اور وہ ایرانیوں کو ساتھ ملا کر اُمویوں سے اقتدار چھیننے میں کامیاب ہو گئے۔ عباسی دور آتا ہے تو عرب اور غیر عرب مسلمان مل جل کر حکومتیں قائم کرتے ہیں، گو اخلاقی سیادت عربوں کے ہاتھ میں رہتی ہے لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں پر غیر عربی چھا جاتے ہیں، آہستہ آہستہ عربوں کا اخلاقی اقتدار بھی کم ہو جاتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ایرانی قومیں اسلام کے بین الاقوامی مرکز کی مالک بن جاتی ہیں اور عربوں کی حیثیت دوسرے درجے کی رہ جاتی ہے۔

مدینہ منورہ اسلام کے اولین بین الاقوامی اور انسانی دور کا مرکز تھا، دمشق خالص عربی قوموں کا مرکز بنا، بغداد میں عرب امیر اور ایرانی وزیر تھے، ایرانیوں نے بغداد کی عباسی خلافت کے زیر تربیت حکومت کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کی، شروع شروع میں تو ایرانی

دَبے رہے۔ اگر چہ عباسیوں نے ان کی مدد سے ہی اُمویوں کو خلافت سے برطرف کیا تھا۔ لیکن ابتداء کے چند عباسی خلفاء نے عربی سیادت کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی، چنانچہ منصور، مہدی، ہادی اور ہارون نے جب بھی موقع ملا، اپنے ایرانی وُزراء اور اُمراء کو جو سلطنت میں بڑے دخیل اور صاحب اقتدار تھے، بے دریغ قتل کروایا، اور ایران کے قدیم افکار کو جو اسلام پر غالب آنے یا اسے اپنے رنگ میں رنگنے کے لئے سر اٹھا رہے تھے، بڑی سختی سے کچلا، لیکن ہارون کے بیٹے مامون کا اپنے بھائی امین کے مقابلہ میں کامیاب ہونا دراصل عربوں کے خلاف ایرانی عنصر کی فتح تھی۔ اس عہد میں خلافت کی فوج میں عربوں کا وجود برائے نام رہ گیا تھا، مامونؒ کے بعد معتصم اور واثق کا زمانہ آیا تو ترک جنہیں ہم تمدُّنی اعتبار سے ایرانی ہی کہتے ہیں، خلافت عباسی کے سیاہ و سفید مالک ہو گئے، مامون نے اپنے عہد خلافت میں غیر عرب مسلمانوں کو حکومت کا اہل پا کر انہیں سلطنت کے بڑے بڑے عہدے بھی دیئے اور بعض کو تو صوبوں کی مستقل حکومتیں بھی عطا کیں۔ اسی زمانے سے عباسی خلافت کے ماتحت مشرق و مغرب میں نیم آزاد سلطنتیں بننا شروع ہوتی ہیں۔ جو اپنے اندرونی معاملات میں تو مستقل تھیں، لیکن حاکمیتِ بالا عباسی خلفاء ہی کی تسلیم کرتی ہیں۔ چنانچہ مشرق میں بخارا، غزنی اور بعد میں دہلی کی سلطنتیں وُجود میں آئی، اور اُدھر مغرب میں مصر اور مراکش کی حکومتیں بنیں۔ اس طرح تقریباً پانچ سو برس اسلام کی مرکزی قوت عرب اقوام کے ہاتھ میں رہی، ان اقوام کی امامت قریش نے کی۔

عربی دورِ حکومت کا جائزہ

قرآن حکیم کی اس اجتماعی تحریک کا پہلا مرکز قریش تھا، قریش کی حکومت تقریباً پانچ سو سال تک رہی، اس کے ابتدائی دور میں قریش میں سے وہ بارہ سردار ہوئے جن کی خوشخبری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ (حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی حضرت علی المرتضیٰ، حضرت امیر معاویہ، رضی اللہ عنہم عبد الملک بن مروان، ولید بن عبدالملک، سلیمان بن عبد الملک، ہشام بن عبد الملک، منصور، مہدی، ہارون الرشید) (4) ان سرداروں نے قیصر و کسریٰ کی حکومتیں مٹا کر دُنیا کے ایک بہت بڑے رقبے پر

اسلامی سلطنت قائم کی، اس حکومت کو اگر سیاسی شُعور کے اعتبار سے جانچا جائے تو وہ انسانیت کے لیے ایک نمونے کی حکومت تھی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ولید بن عبدالملک نے ایک دفعہ کہا تھا:

> ''میری حکومت کو دیکھو! اور غور کرو، کوئی اندھا نہیں جس کے لیے میں نے عصا بردار مقرر نہ کیا ہو، اور کوئی بھوکا اور بیمار نہیں ہے جس کو کھانا اور دوا نہ پہنچتی ہو۔''(5)

ولید بن عبدالملک کی حکومت ایک عرب سردار کی حکومت تھی، خلیفہ راشد کی حکومت نہیں، خُلفائے راشدین کی حکومت تو گویا ایک مثالی حکومت تھی، تاہم قریش کے ان دیگر سرداروں کی حکومت بھی کچھ کم شاندار نہ تھی، ضرورت اس امر کی ہے کہ ان حکومتوں کو اجتماعی نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔ بے شک یہ لوگ شاندار زندگی گزارتے تھے، مگر وہ اس کے ساتھ ساتھ انسانی اجتماع اور اس کی ضرورتوں کا بھی پورا پورا خیال رکھتے اور رعایا کے عُمومی مفاد کو نظر انداز نہ کرتے تھے۔ بدقسمتی سے ہمارے مؤرخین نے تاریخ کو اجتماعی نظر سے دیکھنا چھوڑ دیا ہے، بجائے اس کے کہ وہ بحیثیت مجموعی کسی تحریک، حکومت یا اجتماع کو دیکھتے، وہ حکمرانوں کی خانگی زندگیوں کے پیچھے پڑ گئے، یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخوں میں ان فرمانرواؤں کے ذاتی اور شخصی نقائص بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیے گئے اور اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک مورخ کے نزدیک جس خاندان کو حکومت ملنی چاہئے تھی، اس کی بجائے اس کی مخالف کو حکومت مل گئی اور اوّل الذکر کی مؤخر الذکر سے جنگ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ''قلم بدستِ دشمن'' کا معاملہ تھا، اس لیے یہ مؤرخ اِن حکمرانوں کے متعلق جو کچھ بھی لکھتے، کم تھا۔

ہمیں چاہیے کہ اب ہم تاریخ کو اس طرح نہ پڑھیں، بلکہ ایک حاکم نے عام انسانیت کے لیے جو کچھ کیا، ہمیں اسے بھی پیش نظر رکھنا چاہئے، چنانچہ اگر شاہانِ اسلام کے اجتماعی کام اچھے تھے تو ان کے شخصی نقائص اور ان کا اَوروں سے تھوڑا بہت مالی تفوّق (یعنی اوروں سے مال کی زیادتی) یہ ایسی چیزیں نہیں کہ ہم انہیں اتنی زیادہ اہمیت دیں آخر مسلمانوں کے علاوہ اور قوموں میں بھی بادشاہ گزرے ہیں۔ مسلمانوں کے ان حکمرانوں کا ان سے مقابلہ کیجیے۔

www.rahimia.org

حکومت پر فقہاء کی نگرانی اور صوفیاء کی تنقید

بے شک اسلامی حکومتوں کا یہ عہد محدود مطلق العنانی (شخصی حکومت) کا عہد تھا، اور فرمانروا جو چاہتے تھے کرنے کے مجاز ہوتے تھے، لیکن اس زمانے میں ملک میں ایسی بااثر جماعتیں بھی ہوتی تھیں جو ان حکمرانوں میں اعتدال پیدا کرتی تھیں اور ان کو حد سے آگے بڑھنے سے روک دیا کرتی تھیں، یہ فقہا اور صُوفیاء کی جماعتیں تھیں۔

فقہا قانون کو نافذ کرنے میں بالکل آزاد تھے۔ایک فقیہ قاضی القضاۃ ہوتا تھا اور ساری قلم رَو کے قاضی اس کے ماتحت ہوتے چنانچہ بادشاہ ان قاضیوں کے فیصلوں میں کسی قسم کی مُداخلت نہیں کرتا تھا، اس طرح اسلامی قانون بادشاہ کی سیاست سے آزاد رہتا اور اس کی سلطنت میں ایک مستقل حیثیت تسلیم کی جاتی تھی۔

ملک کا دوسرا عنصر جو ان حکمرانوں کی بے اعتدالیوں کے آڑے آیا کرتا، وہ صوفیاء کا گروہ تھا، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ متوفی ۵۶۱ھ بغداد میں اپنی خانقاہ میں بیٹھے خلفاء کے احکامات پر تنقید کیا کرتے تھے، اور خلفاء تھے کہ آپ کی ان باتوں کو شیرِ مادر کی طرح پی جاتے، عربی حکومت کا یہ آخری دور تھا اس سے پہلے جب عربی حکومت میں زیادہ قوت تھی اور اس کے فرمانروا بڑی طاقت اور دولت و اقبال کے مالک تھے تو وہ صوفیاء اور زُہّاد (زاہدوں) کی صحبت اور نصیحت کو اپنے لیے سعادت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ خطیب بغدادی نے اپنی کتاب ''تاریخ بغداد'' میں ہارون الرشید کے متعلق اس قسم کے بہت سے واقعات نقل کیے ہیں۔

عجم کی اہمیت

سورۃ ''جمعہ'' میں جہاں اس امر کی صراحت یعنی وضاحت کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''امیّین'' یعنی عربوں کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں اس کے ساتھ آخر میں یہ بھی مذکور ہے کہ ان کے علاوہ ان لوگوں کے لیے بھی، جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔ سورۃ ''جمعہ'' کی پوری آیت یہ ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝

ترجمہ:۔ ''وہی ذاتِ اقدس ہے جس نے ''امیین'' میں سے ان کے لیے رسول بھیجا جو ان کو اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، اور ان کا تزکیہ کرتا ہے، ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے، نیز اس ذات اقدس نے اس رسول کو ان لوگوں کے لئے بھیجا ہے جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے، بے شک وہ ذات بڑی عزت والی اور حکمت والی ہے''۔ (۶۲:۲و۳)

ہمارے نزدیک ''وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ'' کے مصداق اہلِ ایران، اہلِ ہند اور دیگر تمام عجمی قومیں ہیں جو بعد میں شامل ہوئیں۔ یا آئندہ ہوں گی۔ ''امیین'' کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، یہ تو اسلام کا قومی منصب تھا۔ اور ''وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ'' کو ہم قرآن کی بین الاقوامی تعلیم کا حاصل سمجھتے ہیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جیسے عربوں کے لیے تھی ویسے ہی عجمیوں کے لیے بھی ہے۔

اب ''وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ'' (یعنی بعد میں آ کر ملنے والے لوگوں) کا زمانہ آتا ہے، اور عربوں کے بجائے یہ لوگ اسلام کی بین الاقوامیت کے محافظ اور سرپرست بنتے ہیں۔ اگر اسلام کو صرف عربی اقوام کے لیے معین کر دیا جائے تو غیر عرب مسلمان اقوام نے جو بڑی بڑی سلطنتیں بنائیں۔ وہ اسلامی اجتماع پر ایک دنبل بن کر رہ جائیں گی، لیکن اگر بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں حیثیتیں یعنی قومی اور عمومی ملحوظ رہیں۔ تو قرآن کے مقاصد پورا کرنے والے عرب اور پھر ان کے بعد عجم ایک ہی درجہ پر آ جائیں گے۔ بیشک عرب اس اجتماعی تحریک کے امام ہیں، انہوں نے سب سے پہلے قرآن کی اجتماعیت کو دنیا میں کامیاب کر کے دکھایا جو قیامت تک انسانی نسلوں کے لیے قرآن کی اجتماعیت پر عمل کرنے کے لیے نمونہ کا کام دیں گے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ عربوں کی مرکزی حکومت کمزور ہونے سے اسلام ہی ختم ہو گیا۔

چنانچہ کئی سو سال تک اسلامی دنیا کی یہ حالت رہی کہ ہر اسلامی ملک اپنی اپنی جگہ

آزاد تھا اور نظم و نسقِ سلطنت میں وہ کسی دوسری طاقت کو اپنا حاکم بالا نہ مانتا تھا، لیکن اس کے باوجود بغداد میں اور پھر قاہرہ میں ایک نام کی اسلامی خلافت قائم رہی۔ جس کے ساتھ دُور سے عقیدت کا اظہار کرنا سلاطین و مُلوک کافی سمجھتے تھے، یہ اسلامی خلافت حقیقت میں اسلام کے اِس تصور کی یادگار تھی کہ یہ دین قومی نہیں، بلکہ بین الاقوامی ہے۔

اب ہوا یہ کہ اسلامی اجتماع کی قیادت پہلے تو عربوں کے ہاتھ میں رہی اس کے بعد عجم اس کے مالک بنے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں ایران فتح ہوا قریش کی اموی خلافت کے دوران نومسلم ایرانیوں میں سیاسی شعور پیدا ہوا، عباسی آئے تو اسلامی ایران اُن کے ساتھ مل کر حکومت کا کام سیکھنے لگا۔ اس طرح خلفائے عباسیہ نے ایرانیوں کو حکومت کے لیے تیار کر دیا، ''بغداد'' میں تو خلفائے عباسیہ کے وُزراء اور ماتحت کی حیثیت سے وہ اسلامی سلطنت میں شریک تھے لیکن ادھر مشرق میں انہوں نے اپنی مستقل حکومتوں کی بُنیاد رکھی چنانچہ جب ''بغداد'' زوال کے نرغے میں آیا تو مشرق میں بخارا کی حکومت کا زور بڑھ گیا، ''بخارا'' کی حکومت کمزور پڑ گئی تو ''غزنی'' کا ستارہ چمکا، ''غزنی'' سے ایرانی مسلمانوں کا مرکز ''لاہور'' میں منتقل ہوا اور لاہور آگے چل کر ''دہلی'' کے مرکز کا پیش خیمہ بنا، اب اگر اسلام کو محض عربی اقوام تک محدود کر دیا جائے اور عربوں کا عُروج و زوال اسلام کے عُروج و زوال کے مترادف سمجھ لیا جائے، جیسا کہ عام طور پر ہمارے اہل علم کا دستور بن گیا ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مسلمانوں کی یہ تمام محنتیں جو بغداد، بخارا، غزنی، قاہرہ اور دہلی کے مرکزوں کو با اقتدار اور شاندار بنانے میں صرف ہوئیں یہ سب بیکار تھیں اور یہ سارے کے سارے مرکز اسلامی اجتماع کے حق میں دنبل (پھوڑا) سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

ہمارا اپنا حال یہ ہے کہ جب سے ہم نے اسلام کی اساسی حکمت کو بین الاقوامی قرار دیا ہے اور ہم قرآن عظیم کو انٹرنیشنل انقلاب کی دعوت کا حامل سمجھتے ہیں، اس وقت سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جو جماعت یا گروہ بھی قرآن کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں کوشاں ہو، خواہ وہ عربوں میں سے ہو یا عجم میں سے وہ سب کے سب ایک ہی درجے پر سمجھے جائیں۔ چنانچہ اسی بناء پر ہمارے نزدیک قرآن کے مقاصد پورا کرنے والے عرب

اور پھر ان کے بعد عجم ایک ہی درجے پر آجاتے ہیں اور جس طرح ہم قریش میں کسی خاص خاندان کا امتیاز نہیں مانتے، اسی طرح ہم اسلامی ملت میں عربوں کی انفرادیت کے قائل نہیں اور ان کی قومی برتری یا شخصی بڑائی کو بالکل تسلیم نہیں کرتے، بے شک عرب اسلام کی اجتماعی تحریک کے امام ہیں اور انہوں نے سب سے پہلے اسلام کے اُصولوں پر ایک اجتماع کی تشکیل کی، اس لحاظ سے وہ تمام انسانی نسلوں کے لیے قیامت تک قرآن کی اجتماعی زندگی کا ایک نمونہ ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب عربوں کی مرکزی قوت کمزور ہوگئی اور ان کا اقتدار باقی نہ رہا تو خُدانخواستہ اسلام بھی ختم ہوگیا، ہمارے نزدیک امیر المومنین حضرت امیر معاویہؓ کی فتوحات اور قسطنطنیہ پر ان کے حملے کی جس قدر عزت اور قدر و منزلت ہے، سلطان محمود غزنویؒ کی کشور کشائیوں کی بھی ہم ویسی ہی قدر کرتے ہیں۔

عجمی عہدِ حکومت

اسلام کی بین الاقوامی تحریک کا یہ چوتھا دور تھا، اس دور میں زمامِ اقتدار کلیتاً غیر عرب مسلمان اقوام میں آگئی اور خود عرب قوم اور اُن کا ملک تک عثمانی تُرکوں کے ماتحت ہو گیا، ان مسلمان اقوام پر ان کے ''قومی'' بادشاہ ہی حکومت کرتے تھے، یہ ان معنوں میں تو جمہور کے نمائندے نہ تھے کہ ان کے عزل و نصب کا اختیار جمہور کو ہوتا ہے، کہ یہ تلوار کے زور سے تخت و تاج کے مالک بنتے تھے اور جو ان میں صالح ہوتا، وہ البتہ جمہور کی مرضی کے مطابق حکومت کرتا تھا، آہستہ آہستہ حکمران بادشاہ جمہور سے دور ہٹتے چلے گئے اور آخر کار ''شاہیت'' اپنے محکوموں کے لیے وبال بن گئی، بدقسمتی سے مسلمان جمہور میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ان کو جو اَب محض نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، مسند اقتدار سے الگ کر کے خود ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور دنیائے اسلام میں قومی شاہی حکومتوں کی بجائے قومی جمہوری حکومتیں بن جاتیں، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ میں تو جمہور نے بیدار ہو کر اپنے مطلق العنان بادشاہوں کو یا تو تخت سے محروم کر دیا، یا انہیں اپنی مرضی کے تابع بنا لیا، لیکن مسلمان جمہور خواب غفلت میں پڑے سوئے رہے اور اگر کبھی ان کو جگانے کی کوشش بھی کی گئی تو جابر بادشاہوں نے اسے اپنے اقتدار کے خلاف سمجھ کر بار آور ہونے نہ دیا۔

قومی جمہوری تحریکات کی تخم ریزی

حُسنِ اتفاق دیکھئے کہ اس ''شاہیت'' کے آخری دور میں کم و بیش ایک ہی زمانہ میں ایسی تحریکیں شروع ہوئیں، جن کے مخاطب جمہور تھے، یہ تحریکیں قومی اور جمہوری تھیں۔ ان کے بانیوں کے پیشِ نظر ساری دنیائے اسلام نہ تھی، بلکہ صرف اپنی قوم کے جمہور تھے۔

☆ عثمانی ترکوں کے ہاں اس تحریک نے تنظیمات کی شکل اختیار کی۔(6)

☆ عربوں میں محمد بن عبدالوہاب نجدی پیدا ہوئے۔(7)

☆ شمالی افریقہ امیں امیر عبدالقادر الجزائری نے قوم کی زمامِ قیادت سنبھالی۔(8)

☆ مصر میں خُدیو محمد علی اہل مصر کے قومی جذبات کے ترجمان بنے۔(9)

☆ ایران میں بھی قومی بیداری نے جنم لیا۔(10)

شاہ ولی اللہؒ اور ان کے نام لیواؤں نے ہندوستان کے مسلمان جمہور کو منظم کرنے کی کوشش کی۔

بدقسمتی سے ان تحریکوں کا آغاز ہی ہوا تھا کہ یورپ کے جمہور جو تقریباً دو صدی پہلے بیدار ہو چکے تھے، مشرقی ملکوں پر پل پڑے (چڑھ دوڑے) اور بجائے اس کے کہ وہاں قومی بادشاہوں کی وارث قومی پارلیمانی حکومتیں بنتیں۔ یورپ والے بیچ میں آ گئے اور تمام دنیائے اسلام اِن ستم گاریوں سے تہہ و بالا ہو گئی۔

قومی جمہوری دور

۱۹۱۸ء سے اسلامی دنیا میں ایک نئے دور کی ابتداء ہوتی ہے، اسلامی ملکوں میں ایک صدی پہلے جن قومی جمہوری تحریکوں کا بیج بویا گیا تھا، گو یورپ کے سیلاب نے اسے برگ و بار لانے کا اس وقت موقع نہ دیا، لیکن وہ بیج اندر ہی اندر نشوونما پاتا رہا۔ اور جونہی گذشتہ جنگِ عظیم ختم ہوئی اور محکوم قوموں کو سر اُٹھانے کی فُرصت ملی تو تقریباً ہر اسلامی ملک میں عوام نے آزادی کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ تُرکی میں مصطفےٰ کمال نے قومی جمہوری حکومت کی بُنیاد رکھی۔ مصر میں سعد زغلول نے قومی پارلیمنٹ بنائی۔ شام، فلسطین، طرابلس،

تیونس اور مراکش وغیرہ میں بھی قومی تحریکیں اٹھیں، لیکن وہاں کے جمہور اپنی آزاد حکومتیں بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے، ہندوستانی مسلمان بعض مخصوص حالات کی بناء پر اپنے ملک کی قومی تحریک میں شامل ہونے سے ہچکچاتے رہے۔

دُنیائے اسلام میں یہ قومی حکومتوں کا جمہوری دور ہے، اس دور میں ایک مسلمان قوم کسی دوسری مسلمان قوم کی حکومت قبول کرنے کو تیار نہیں، اور نہ کسی اسلامی ملک کے جمہور اپنے مطلق العنان بادشاہ کی جابرانہ حکومت ہی گوارا کر سکتے ہیں۔ جن مسلمان بادشاہوں نے رعایا کے خلاف مرضی من مانی حکومت کرنی چاہی اُن کا حشر دنیا دیکھ چکی ہے اور جس مسلم قوم نے دوسری مسلم قوم پر زبردستی حکومت کرنے کی کوشش کی اس کا انجام گزشتہ جنگ عظیم میں عربوں اور ترکوں کے معاملہ میں واضح ہو چکا ہے۔

الغرض اس دور میں ہر اسلامی ملک اپنی جگہ آزاد ہونا چاہتا ہے وہ کسی نام سے بھی اپنے ملک میں دوسروں کی دخل اندازی برداشت نہیں کر سکتا اور نہ وہ دوسروں کے سر پر اپنی حکومت تھوپنے کا روادار ہے۔ چنانچہ ہر قوم اپنی زبان کو ترقی دے رہی ہے، افغان پشتو کی ترویج کر رہے ہیں، ایران میں فارسی کو زندگی کے ہر شعبے میں لازمی بنا دیا گیا ہے، عربی بولنے والی قومیں عربی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا چکی ہیں، اور ترک تو زبان کے معاملے میں کافی نام بھی پیدا کر چکے ہیں۔ اس دور میں اسلام کی بین الاقوامی تحریک کی حامل کوئی ایک قوم نہیں رہی، ان چودہ برسوں میں اسلام کا دائرہ کافی وسیع ہو چکا ہے، اب عربوں کے علاوہ اور قومیں بھی مسلمان ہو چکی ہیں۔ لہٰذا اب اگر کبھی کوئی بین الاقوامی اسلامی ادارہ بنے گا تو اس میں ساری مسلمان قومیں برابر کی شریک ہوں گی، یعنی ہر مسلمان قوم اور ہر اسلامی ملک اپنی جگہ آزاد ہوگا اور پھر یہ آزاد قومیں اور ممالک باہم مل جل کر کسی بین الاقوامی ادارہ کی تشکیل کریں گے۔

الغرض اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ درج ذیل ان مختلف ادوار میں سے گزر چکی ہے:

(۱) حضور اقدس ﷺ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک، جب کہ ساری اُمت متفق و متحد رہی، اسلامی حکومت کا مثالی دور ہے۔

(۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت، ''عربی قومی حکومت'' اور السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کی مثالی حکومت کی بیچ کی کڑی ہیں۔

(۳) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مسلمان عربوں کی حکومت شروع ہوتی ہے:

(الف) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے ہشام ابن عبد الملک تک (دورِ بنو اُمیہ)۔

(ب) منصور السفاح سے ہارون الرشید تک (دورِ بنو عباس)۔

(۴) خلیفہ ہارون الرشید پر عربی سیادت کا دور ختم ہو جاتا ہے۔

(۵) مامون الرشید سے زوالِ بغداد تک عباسی خلافت کے زیر سایہ عجمی قومیں برسرِ اقتدار آتی ہیں۔

(۶) زوالِ بغداد سے عربیت کا کلی خاتمہ ہو جاتا ہے اور خالص ترکی (خلافتِ عثمانیہ) کا دور شروع ہو جاتا ہے۔

(۷) 1918ء میں ترکی کی آخری نشانی یعنی عثمانی سلطنت کا چراغ سحری بجھ جاتا ہے اور یہاں سے قومی جمہوریتوں کا آغاز ہوتا ہے۔

ہمارا یہ دور قومی جمہوریتوں کا دور ہے، لیکن یہ قومی جمہوری رنگ اسلام کی بین الاقوامی رُوح کے خلاف نہیں، مسلمانوں کی نجات اب اس میں ہے کہ پہلے تو وہ اپنے اپنے علاقوں میں آزاد ہوں۔ اور آگے چل کر یہ آزاد اکائیاں اپنی کوئی بڑی وحدت بنا لیں، لیکن اس وقت تو مقدم یہ ہے کہ ہر ملک آزاد ہو، اسلامی بین الاقوامیت اس کے بعد کی چیز ہے۔

اسلامی بین الاقوامیت کے نام سے قومی تحریکوں کی مخالفت کرنے والے غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اگر ہم ان اہل الرائے کی بات صحیح مان لیں، جن کے نزدیک قومی حکومتوں کا تصور اسلام کے خلاف ہے اور اسلامی حکومت صحیح معنوں میں صرف ایک بین الاقوامی حکومت ہی ہو سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صدہا سال سے اسلامی حکومت اس دنیا سے ناپید ہے اور پھر جہاں تک اس زمانے کے حالات کا تعلق ہے بظاہر اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ آئندہ کوئی اس طرح کی حکومت معرضِ وجود میں آ سکے۔

اگر ان کی یہ بات تسلیم کر لی جائے تو نعوذ باللہ اس کے یہ معنی ہوئے کہ اسلام

بحیثیت ایک نظامِ سلطنت کے ان تیرہ سو سالوں میں صرف گنتی کے برس جی سکا اور اب اس کے دوبارہ اُبھرنے کا بھی زیادہ امکان نہیں، اور جب اسلام کے نظام کی دیرپائی کا یہ عالم ہو تو اس کے عقائد کی بلندی اور پاکیزگی سے دنیا کیا متاثر ہوگی۔ اسلام اور اس کی تاریخ کی اس طرح تعبیر کرنے والے دوستی کے پردے میں اسلام کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جو بلند دعاوی وہ زبان سے پیش کرتے ہیں اگر ان دعاوی کو عملی نقطۂ نظر سے پرکھا جائے تو نتیجہ ان دعاوی کے بالکل برعکس نکلتا ہے۔

اسلام کے اس طرح کے نظریہ ساز پہلے تو اسلام کے متعلق ایک موہوم تصور پیش کرتے ہیں اور جب اپنی گرد و پیش کی زندگی اور ماضی کی تاریخ میں کہیں بھی اپنے اس موہوم تصور کو عملی جامہ پہنتے نہیں دیکھتے تو پھر اپنی ایک خیالی دنیا بساتے ہیں، لوگوں کو اس دنیا میں آباد ہونے کی بڑی گرم جوشی سے دعوت دیتے ہیں اور چونکہ اس کے لئے محض خیالی آفرینی شرط ہے اور ماحول سے جھیڑ چھاڑ کرنا ضروری نہیں ہوتا اس لئے عمل پر خیال کو ترجیح دینے والے ذوق و شوق سے ادھر متوجہ ہو جاتے ہیں اور بزعمِ خویش سمجھ لیتے ہیں اسلام کی نئی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ خود تو کچھ نہیں کر پاتے اور نہ خیالی دنیا سے کبھی باہر قدم رکھتے ہیں، لیکن جو لوگ عملی زندگی کی دشواریوں، رکاوٹوں اور آلائشوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی قوم جس پستی میں وہ ہے، اس سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور جن حالات میں وہ قوم گھری ہوئی ہوتی ہے، ان حالات کے مطابق قوم کو پستی سے بلندی کی طرف لے جانے کی تدبیریں کرتے ہیں، وہ ان کے نزدیک مردود اور گھٹیا انسان ہیں، دوسرے لفظوں میں جو کہے اور کچھ نہ کرے وہ ''مجددِ ملت'' اور جو کچھ کرنے کی کوشش کرے اور ظاہر ہے کام ہمیشہ گرد و پیش کے حالات کو مدنظر رکھ کر ہی ہو سکتا ہے اور اس کے لئے بلندی سے نیچے اُترنا پڑتا ہے، وہ ''مردود'' ٹھہرے۔

حوالہ جات وحواشی:

(1) ''اسلام کا تاریخی کارنامہ''، مصنف ایم۔ این رائے، باب سوم، ''اسلام کا سماجی اور تاریخی پس منظر'' انگریزی ایڈیشن، مطبوعہ 1958ء سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور۔ و اُردو ترجمہ ازعلی امام، مطبوعہ رسالہ ''عالمگیر''۔

(2) ''تمدنِ عرب'' ازموسیولیبان۔

(3) ایضاً۔

(4) ''التمهيد لتعريف آئمة التجديد'' ازمولانا عبیداللہ سندھیؒ۔

(5) ایضاً۔

(6) ترکی میں سلطنت عثمانیہ کے زمانہ میں سلطان عبدالمجید کے عہد (1839ء تا 1861ء) میں ''تنظیمات'' کے نام سے قومی اصلاحات کا ایک نظام متعارف کرایا گیا جنھیں بعد میں سلطنت کے نظام حکمرانی میں داخل کردیا گیا۔ یہ اہم ترین اصلاحات 1856ء میں کی گئیں۔ اورانہیں کی اساس پر 1879ء میں قانونِ اساسی تشکیل دیا گیا۔ انہی اصلاحات کو''تنظیمات'' کے نام سے یادکیا جاتا ہے۔

(7) محمد بن عبدالوہاب ۱۱۱۵ھ بمطابق 1704ء میں ریاض کے قریب (عینیہ) میں پیدا ہوئے، انہوں نے سیاسی حوالہ سے عربوں میں قومی بیداری کا کام کیا اور ترکوں کے مقابلہ ''پرعربیت'' کوفروغ دیا، انہوں نے امیر محمد بن سعود (امیرالدرعیہ) کے ساتھ مل کر 1856ء میں مسلح جدو جہد شروع کی۔ ان کا انتقال ۱۲۰۶ھ بمطابق 1792ء میں ہوا۔

(8) امیر عبد القادر جزائری 1808ء میں الجزائر (شمالی افریقہ) میں پیدا ہوئے۔اور 1883ء میں دمشق میں انتقال ہوا۔ انہوں نے 1832ء سے 1847ء تک الجزائر کی قومی آزادی کے لئے بڑی جدوجہد کی اور فرانس کے خلاف کئی جنگیں لڑیں، پھر مجبوراً جلاوطنی کی زندگی گزارنی پڑی اور دمشق آگئے۔ اور وہیں پر انتقال ہوا۔ لیکن الجزائر کی قومی آزادی میں اُن کا کردار ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔

(9) خُدَیْوْ محمد علی (1769ء تا 1844ء) نے ترکی فوج میں اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا، 1789ء میں فرانسیسی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک فوج کے ساتھ مصر بھیجا گیا ان کی فوجی قابلیتوں کی وجہ سے جلد ہی انہیں فوج کا کمانڈر مقرر کردیا گیا۔ 1801ء میں فرانسیسیوں کی شکست کھاجانے اور انگریزوں کے مصر چھوڑنے کے بعد مصر کا پرانا

www.rahimia.org

نظامِ حکومت ٹوٹ چکا ہے۔ 1571ء سے مصر ترکوں کی عملداری میں تھا اور اس کا نظامِ حکومت یہ تھا کہ سلطان ترکی کی جانب سے ایک پاشا یا نائب السلطنت مصر میں مقرر کیا جاتا تھا۔ اور اس کی امداد کے لئے 20 مملوکوں پر مشتمل ایک کونسل ہوتی تھی، نپولین بوناپاٹ کے مصر پے در پے حملوں کے نتیجہ میں مملوکین کا خاتمہ ہوچکا تھا، انگریزوں کے جانے کے بعد مصر میں پیدا ہونے والے قومی جذبات کے پیش نظر محمد علی نے اس نظام کو ختم کر کے اپنی حکمرانی کا اعلان کردیا انہوں نے پرانا حکمرانی کا نظام ختم کرکے نیا قومی نظام تشکیل دیا ان کے دور میں قومی حوالہ سے مصر کی علمی ثقافتی اور معاشی ترقی کے نئے دور کا آغاز ہوا، ان کے بعد ان کا بیٹا ابراہیم پاشا حکمران ہوا، اور اس کے بعد اس کا بیٹا اسماعیل پاشا حکمران ہوا۔ جس کو سلطان عبدالعزیز نے ''خدیو'' کا لقب دیا۔ جو بعد میں محمد علی کے تمام حکمران خاندان کے لئے استعمال ہونے لگا۔ خدیو مسلمان حکمرانوں کا لقب ہے۔ فارسی میں اس کا معنیٰ وزیر ہے۔ یہ لفظ مصر کے حکمرانوں کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اسماعیل پاشا کے بعد اس کا بیٹا خدیو توفیق اور پھر اُس کا بیٹا خدیو عباس حلمی حکمران ہوا۔ اس پورے خاندان کو ''خاندانِ خُدیویہ'' کہا جاتا ہے۔

(10) بیسوی صدی کے آغاز میں قومی جمہوریت کے حوالہ سے ایران میں بھی بیداری کی کافی تحریکات اُٹھیں، اور مختلف لیڈروں نے اس حوالہ سے انقلابی تحریکات چلائیں۔ (آزاد)

www.rahimia.org

مقالہ نمبر (۱۵)

﴿شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی تحریک﴾

اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل یعنی ۱۷۰۳ء میں مفکر اعظم مجدد ملت حضرت مولانا شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۷۶۳ عیسوی صرف ۶۱ سال کی عمر میں آپ اس دنیا سے رُخصت ہو گئے۔

انگریز جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجتماعی طاقت کے ساتھ ۱۶۰۸ عیسوی میں ہندوستان میں تجارت کے لیے داخل ہوئے تھے اپنی عیارانہ سازشوں کے تحت ۱۶۶۳ عیسوی میں اس قابل ہو گئے کہ ہر قسم کی جنگ کرنے کے لئے پَر تولنے لگے۔ تاہم عالمگیر کے عہد حکومت تک انہیں سیاست میں دخل اندازی کا براہ راست موقع نہ ملا۔ اگر چہ در پردہ وہ حکومت کی بعض باغی طاقتوں مثلاً مرہٹوں وغیرہ کو اُکساتے رہے، اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب مرہٹوں نے شیواجی کی قیادت میں دفعتاً (اچانک) سُورت پر حملہ کر کے وہاں کے باشندوں اور تاجروں کو لوٹا تھا تو انگریز تاجروں کی کوٹھیاں محفوظ چھوڑ دی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریز کے ایماء پر ہی یہ خُفیہ چھاپہ پہلے سے طے شُدہ منصوبے کے مطابق مرہٹوں نے مارا تھا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ شروع دن سے ہی انگریزوں کے کیا عزائم اور کیا مقاصد تھے؟ اور وہ کس طرح ہندوستان کے حکمران بن جانے کے خواہش مند تھے، ٹھیک اِنہی دنوں میں عُلماء کا ایک گروہ بھی یہ کوشش کر رہا تھا کہ ملک کا نظام سیاسی اسلامی عدل پر قائم ہو جائے اور اس کے ذریعے تمام مفاسد کا سدِّ باب کر دیا جائے، یہاں سے علماء کی بالغ نظری اور ان کے کاموں کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عالمگیر کی وفات کے بعد ہندوستان میں مغلوں کی سیاسی قوت کا زوال شروع ہو گیا اور پورا ملک تیزی سے انتشار کی گرفت میں چلا گیا، اس زمانے میں نادر شاہ نے دہلی کو لوٹا، وسط ہند اور مہاراشٹر صوبے میں مرہٹوں نے غلبہ حاصل کیا، مختلف صوبوں کے گورنر

www.rahmia.org

خودمختار بن گئے۔ شمالی ہند میں سکھوں کے فوجی گروہ نے سر اٹھایا اور انگریزوں نے کھل کر ہندوستان کے اِن سیاسی حالات میں دخل دینا شروع کر دیا۔

شاہ ولی اللہؒ کا انقلابی پروگرام

مسلمانوں کی قوت کا یہ ہمہ گیر سقوط (مکمل زوال) سخت تشویش ناک تھا، لیکن اس پر گہری نظر حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ڈالی، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ شاہ صاحبؒ کا انتقال ۱۷۶۳ء میں ہو گیا۔ جبکہ ۱۷۸۹ء کا انقلابِ فرانس شاہ صاحبؒ کی وفات کے ۲۶ سال بعد برپا ہوا جسے جمہوریت و آزادی کا نشانِ راہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اشتراکیت کا بانی کارل مارکس بھی ۵۵ سال بعد ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا، جسے اقتصادی اور معاشی انقلاب کا داعی اول کہا جاتا ہے۔ لیکن کیا یہ بات قابل توجہ نہیں کہ انقلاب فرانس سے تقریباً ۵۰ سال قبل اور اشتراکی انقلاب سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل حضرت شاہ ولی اللہؒ نے آنے والے دور کے لیے اسلام کے سیاسی، اقتصادی، معاشی اور تہذیبی نظام کے وہ عالمگیر اُصول مُدون کر کے پیش کر دیئے تھے جو قوموں کے پیچیدہ مسائل کا بہترین حل اور انسانیت کی نجات کے سب سے بڑے ضامن ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ پریس اور پروپیگنڈے کی وہ طاقت جو مارکس کے متبعین کو حاصل ہوئی اور انقلاب فرانس کے داعیان نے حاصل کی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے افکار کی اشاعت کے لیے میسر نہ آ سکی، ورنہ شاید دنیا کی تاریخ آج کچھ اور ہوتی، بہر حال جیسے جیسے اس سرزمین پر انگریز کے قدم بڑھتے اور مضبوط ہوتے گئے۔ ویسے ویسے شاہ صاحبؒ کی قائم کردہ جماعت علماء کی کوششیں بھی تیز تر ہوتی گئیں۔ شاہ صاحبؒ نے حالات کا گہرا مطالعہ فرمایا اور حال و مستقبل کے رُجحانات کا جائزہ لے کر اسلامی فکر و عمل کا مکمل دستور العمل پیش فرمایا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک جماعت کی تشکیل بھی کی۔

﴿ولی اللّٰہی تحریک کے ارکان اول﴾

اس زمانے میں اس جماعت کے ارکانِ خاص مندرجہ ذیل علماء تھے، جن کا دائرۂ اثر

دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔

(۱) مولانا محمد امین ولی اللّٰہی کشمیری:۔ یہ شاہ صاحبؒ کے جان نثار ساتھی تھے اور شاہ صاحبؒ کے بعد ان کی جماعت کے مُربی رہے۔

(۲) مولانا محمد عاشق پھلتیؒ:۔ یہ پھلت ضلع مظفر نگر کے رہنے والے، شاہ صاحبؒ کے عزیز ترین و مخلص رفیق اور شاہ صاحب کے نظریاتِ انقلاب کے زبردست حامی تھے اُنہوں نے بھی اس جماعت کی خصوصی تربیت فرمائی۔

(۳) حضرت مولانا شاہ ابوسعید رائے بریلیؒ:۔ یہ حضرت سیدٗ احمد شہیدؒ کے نانا تھے، انگریزوں کے خلاف سلطان ٹیپو اور اس کے والد کی کوششوں میں آپ کا زبردست تعاون تھا۔

(۴) حضرت مولانا نوراللہ بڈھانویؒ:۔آپ کے ہی پوتے مولانا عبدالحئ بڈھانوی تھے جو سید احمد شہیدؒ کے دو بڑے ساتھیوں میں ایک ہوئے۔

(۵) سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ:۔ یہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے فرزند جلیل تھے اور آپ کے بعد آپ کے جانشین اور آپ کی جماعت کے قائد اعلیٰ تھے۔

(۶) حضرت مولانا مخدوم لکھنویؒ۔

(۷) مخدوم ملا معین الدین ٹھٹھویؒ:۔ یہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خلیفہ اَجل اور سندھ میں تحریک کے پھیلانے والے تھے۔

ولی اللّٰہی تحریک کا وسیع حلقۂ اثر

شاہ صاحبؒ کی یہ تحریک پورے ہند، وسطِ ایشیا اور بلادِ عرب تک پھیل گئی تھی، اس لئے ان اکابرین کے علاوہ (جن کا اوپر ذکر ہوا) دور و قریب کے بے شمار علماء اس سے وابستہ تھے جن کی تفصیل بڑی طوالت چاہتی ہے، اس تحریک کے مراکز دہلی کے علاوہ اَودھ، جنوبی ہند، سندھ اور بیرونِ ہند کے کئی مقامات تھے۔ شاہ صاحبؒ کی اس تحریک کا نقطۂ آغاز ایک دینی مرکز ''مدرسۂ رحیمیہ'' سے ہوا اور یہی سلسلہ بعد کے دور میں پھیلتا چلا گیا۔

www.rahimia.org

عالمگیرؒ کا عہد

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر نے وفات پائی۔ اور شہزادوں کی جنگِ اقتدار نے یورپ و ایشیا کی سب سے بڑی خوشحال سلطنت کی بنیادیں ہلا دیں۔ عظیم ترین انسانوں کی اکثر یہ بدنصیبی رہی ہے کہ ان کے وارث و جانشین عمومی طور پر نااہل ثابت ہوتے ہیں، عالمگیر وسیع ترین مغل سلطنت کا فرمانروائے اعظم تھا اور ان تمام خوبیوں کا حامل تھا جو اتنے بڑے حاکم میں ہونی چاہئیں، وہ پابند دین مسلمان تھا۔ سلطنت اس نے قوت بازو سے حاصل کی تھی اور پچاس سال تک اس عظیم سلطنت کا نظام سنبھالے رکھا۔ اس کے مشیر اور اس کی دینی زندگی کے رہنما علماء کرام ہی تھے اور اس نے بھی علماء کے ساتھ اپنے تعلق و نیازمندی کو آخر وقت تک قائم رکھا۔

سلطنتِ مُغلیہ کا زوال

ایک بڑی سلطنت کا کمزور ہونا ایک پہاڑ کے ٹوٹ جانے کے مترادف ہوتا ہے، اگر ایک معمولی دیوار گرے تو سنبھالی جا سکتی ہے، لیکن اگر ایک پہاڑ ٹوٹنے لگ جائے تو اسے کسی طرح بھی قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ ہندوستان کی مغل سلطنت ہی نہیں، دنیا کی ہر بڑی سلطنت کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے، جب وہ سلطنت کمزور ہوئی تو پھر کسی کے سنبھالے نہ سنبھل سکی۔

اکبر سے عالمگیر کے عہد تک تو اس سلطنت کا وہ دور تھا جب اسے اسلامی عدل کی بنیادوں پر ہمیشہ کے لیے استوار کیا جا سکتا تھا، لیکن عالمگیر کے بعد اس کی یہ حیثیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی نظر اس حقیقت پر تھی۔ چنانچہ آپ نے اپنی تحریروں میں اس سلطنت کو "لُعْبَةُ الصِّبْيَانْ" یعنی "بچوں کا کھیل" سے تعبیر کیا ہے اور ایک نئے اسلامی انقلاب کو ہی اپنی جدوجہد کا مقصود قرار دیا۔

انگریز اور علماء کے درمیان کشمکش

عالمگیرؒ کی وفات کے بعد ہندوستان کی جو حالت تھی، اس میں امراء اور راجگانِ ہند کی

آپس کی چپقلش تو محض ایک ظاہری حیثیت کی حامل تھی، اصل معرکہ انگریزوں اور ولی اللّٰہی جماعت کے علماء کے درمیان تھا، اور دو منظم قوتیں ہی اس وقت میدانِ عمل میں تھیں۔

ایک انگریز کی قوت جو تمام مادی وسائل و ذرائع اور خفیہ چالاکیوں اور مکاریوں کی ماہر تھی۔

دوسری ولی اللّٰہی جماعت علماء کی طاقت جو اگرچہ نظم و ضبط میں انگریزوں سے بھی بہتر تھی لیکن دوسرے وسائل و ذرائع سے بالکل محروم تھی۔

یہ تو تھی اسلامی نظام عدل کی راہ ہموار کرنے کی ظاہری کوشش، جس کی ابتداء حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے کی تھی اس کے ساتھ ساتھ شاہ صاحبؒ نے ان معاشی اور اقتصادی مسائل کا حل، جو مارکس کے زمانے میں پیدا ہوئے اور نظامِ سلطنت کے اُصول، جن کا ارتقاء انقلابِ فرانس سے شروع ہوا تھا، بہت عرصہ قبل مرتب کر ڈالے تھے، دوسروں کے لیے چاہے یہ حیرانی کی بات ہو لیکن وہ مسلمان جنہیں اللہ نے کتاب و سنت کو سمجھنے کی توفیق عطاء فرمائی ہے، وہ جانتے ہیں کہ شاہ صاحبؒ کے سامنے اسلام کے اصل ماخذ موجود تھے اور آپ نے آئندہ زمانے کی ضروریات کا اندازہ فرما کر اِن مآخذ ہی سے یہ اُصول ترتیب دیئے۔

شاہ ولی اللہؒ کا نظریہ حکمرانی

شاہ صاحبؒ نے نظامِ حکومت کے لیے جو تصور و نظریہ دیا وہ ان کی مشہور کتاب ''البدور البازغہ'' میں دیکھا جا سکتا ہے، آپ نے ایسی سلطنت کے بارے میں جو اعلیٰ تمدُّن رکھنے والی اور ترقی پذیر ہو۔ اس کی بُنیادی ضرورتوں کے لیے پانچ شعبے تجویز کیے جن کے چلانے کے لیے خاندان نسل، رنگ، فرقے وغیرہ کے امتیاز سے بالا ہو کر اہلیت رکھنے والے ماہرین کا تقرر تجویز کیا اور ایسی حکومت کی سربراہی کے لیے جامع اہلیت، اعلیٰ کارکردگی اور بہترین صلاحیتیں رکھنے والا فرد ضروری قرار دیا جس کا نام آپ نے ''امام الحق'' رکھا، لیکن اگر یہ امام الحق دستیاب نہ ہو تو پھر حکومت کے لیے یہ شکل تجویز فرمائی کہ:

''اِجْتِمَاعُ مِنْ عُقَلَاءِ الْقَوْمِ وَ مُبْرِزِیْهِمْ''

"اولاً چند اربابِ فہم و دانش، اہل اور تجربہ کار افراد کی پارلیمنٹ مل کر یہ فریضہ انجام دیں"۔(1)

شاہ ولی اللہؒ کے اقتصادی اصول

موجودہ عالمی مسائل میں اہم مسائل اقتصادیات و معاشیات کے مسائل ہیں، ان مسائل کی اہمیت اب اتنی بڑھ چکی ہے کہ زندگی کے تمام شعبے ان سے متاثر اور ان کی گرفت میں ہیں۔ اقتصادیات و معاشیات کے مثبت و منفی پہلوؤں پر مبنی دو نظام ہمارے دور کی پیداوار ہیں۔ ایک صنعتی سرمایہ دارانہ نظام اور دوسرا محنت کا اشتراکی نظام، یورپ میں ابھی ان مسائل نے جنم بھی نہیں لیا تھا کہ سرزمین مشرق کا ایک زبردست دینی عالم اور مفکر اعظم اسلام کی روشنی میں انہیں حل کر چکا تھا۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ نے اقتصادیات کے بارے میں طے کیا کہ:

(۱) دولت کی اصل بُنیاد محنت ہے، مزدور اور کاشت کار قوت کاسبہ ہیں، باہمی تعاون شہریت کی رُوح رواں ہیں۔ جب تک کوئی شخص ملک اور قوم کے لیے کام نہ کرے، ملک کی دولت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں۔

(۲) جُوا، سٹہ اور عیاشی کے اڈے ختم کیے جائیں جن کی موجودگی میں تقسیم دولت کا صحیح نظام قائم نہیں ہوسکتا اور بغیر اس کے کہ قوم اور ملک کی دولت میں اضافہ ہو، دولت بہت سی جیبوں سے نکل کر ایک طرف سمٹ آتی ہے۔

(۳) مزدور، کاشت کار اور جو لوگ ملک اور قوم کے لیے دماغی کام کریں، دولت کے اصل مستحق ہیں۔ ان کی ترقی اور خوشحالی ملک اور قوم کی ترقی اور خوشحالی ہے جو نظام ان قوتوں کو دبائے وہ ملک کے لیے خطرہ ہے، اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔

(۴) جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے مزدوروں اور کاشت کاروں پر بھاری ٹیکس لگائے، قوم کا دُشمن ہے، اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔

(۵) ضرورت مند مزدور کی رضامندی قابل اعتبار نہیں، جب تک اس کی محنت کی وہ قیمت ادا نہ کی جائے جو امدادِ باہمی کے اُصول پر لازم ہوتی ہے۔

(۶) جو پیداوار یا آمدنی، تعاونِ باہمی کے اُصول پر نہ ہو تو وہ خلافِ قانون ہے۔

(۷) کام کے اوقات محدود کئے جائیں۔ مزدوروں کو اتنا وقت ضرور ملنا چاہیے کہ وہ اخلاقی اور روحانی اصلاح کر سکیں اور ان کے اندر مستقبل کے متعلق غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

(۸) تعاون باہمی کا بہت بڑا ذریعہ تجارت ہے لہٰذا اس کو تعاون کے اُصول پر ہی جاری رہنا چاہیے۔ بس جس طرح تاجروں کے لیے جائز نہیں کہ وہ "بلیک مارکیٹ یا غلط قسم کے "کمپیٹیشن" (مقابلہ) سے روح تعاون کو نقصان پہنچائیں، ایسے ہی حکومت کے لیے درست نہیں کہ بھاری ٹیکس لگا کر تجارت کے فروغ و ترقی میں رکاوٹ پیدا کرے یا رخنہ ڈالے۔

(۹) وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقے میں منحصر کر دے، ملک کے لیے تباہ کن ہے۔

(۱۰) وہ شاہانہ نظامِ زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کی عیش و عشرت کے سبب سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو، اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد از جلد ختم کر کے عوام کو اس مصیبت سے نجات دلائی جائے اور اُن کو مساویانہ نظام زندگی کا موقع دیا جائے۔

سیاسیات کے بُنیادی اصول

(۱۱) زمین کا مالکِ حقیقی اللہ (اور ظاہری نظام کے لحاظ سے اسٹیٹ) ہے، باشندگانِ ملک کی حیثیت وہ ہے جو کسی مسافر خانہ میں ٹھہرنے والوں کی، ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حق انتفاع میں دوسرے کی دخل اندازی قانوناً ممنوع ہو۔

(۱۲) سارے انسان برابر ہیں کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مالکِ ملک، ملک الناس، مالکِ قوم یا انسانوں کی گردنوں کا مالک تصور کرے، نہ کسی کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی صاحبِ اقتدار کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرے۔

(۱۳) اسٹیٹ کے سربراہ کار کی وہ حیثیت ہے جو کسی وقف کے متولی کی، وقف کا

متولی اگر ضرورت مند ہو تو اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ عام باشندۂ ملک کی طرح زندگی گزار سکے۔

بُنیادی انسانی حقوق

حجتہ اللہ البالغہ اور البدور البازغہ وغیرہ تصانیف میں ارتفاقات (مفادات عامہ) کے عنوان سے بہت مفصل بحث موجود ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ:

(۱۴) روٹی کپڑا مکان اور ایسی استطاعت کہ نکاح کر کے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کر سکے، بلالحاظ مذہب و نسل ہر ایک انسان کا پیدائشی حق ہے۔

(۱۵) اس طرح مذہب، نسل یا رنگ کے کسی تفاوت کے بغیر عام باشندگان ملک کے معاملات میں یکسانیت کے ساتھ عدل و انصاف، ان کے جان و مال کی حفاظت، ان کی عزت و ناموس کی حفاظت، حق ملکیت میں آزادی، حق شہریت میں یکسانیت، ہر باشندۂ ملک کا بُنیادی حق ہے۔

(۱۶) زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنا ہر ایک فرقہ کا بُنیادی حق ہے

بین الاقوامی تحفُّظات

(۱۷) ان حقوق کے حاصل کرنے کی شکل یہ ہے کہ خود مختار علاقے بنائے جائیں، یہ خودمختار اکائیاں اپنے معاملات میں آزاد ہوں، ہر ایک یونٹ میں اتنی طاقت ضرور ہونی چاہیے کہ اپنے جیسے یونٹ کے اقدام کا مقابلہ کر سکے یہ تمام اکائیاں ایک ایسے بین الاقوامی نظام میں منسلک ہوں جو طاقت کے لحاظ سے اقتدار اعلیٰ کا مالک ہو، اس کو یہ حق نہیں ہوگا کہ کسی مخصوص مذہب یا مخصوص تہذیب کو کسی یونٹ پر لاد سکے۔ البتہ اس کا یہ فرض ضرور ہوگا کہ کسی قوم یا یونٹ کو یہ موقع نہ دے کہ کسی دوسری قوم کے معاملات میں دخل اندازی کرے۔

مذہبیات

(۱۸) دین اور سچائی کی اصل بُنیاد ایک ہے اس کے پیش کرنے والے ایک سلسلے کی

کڑیاں ہیں۔

(۱۹) داعیانِ صداقت ہر ملک اور قوم میں گزرے ہیں اُن سب کا احترام ضروری ہے۔

(۲۰) سچائی اور دین کے بُنیادی اُصول تمام فرقوں میں تقریباً تسلیم شدہ ہیں مثلاً اپنے پروردگار کی عبادت، اس کے لیے نذر و نیاز، صدقہ و خیرات، روزہ وغیرہ یہ سب کام سب کے نزدیک اچھے ہیں۔ البتہ عملی صورتوں میں اختلاف ہے۔

(۲۱) ساری مہذب دنیا کے سماجی اُصول اور اُن کا منشاء مقصد ایک ہے، مثلاً ہر ایک مذہب اور فرقہ جنسی انارکی (غیر قانونی تعلقات) کو ناپسند اور اخلاقی جُرم قرار دیتا ہے، جنسی تعلقات کے لیے مرد اور عورت میں ایک معاہدہ ہر ایک فرقے میں ضُروری ہے۔ البتہ معاہدے کی صورتیں مختلف ہیں، ایسے ہی ہر ایک فرقہ اپنے مُردے نظروں سے غائب کرنا ضروری سمجھتا ہے، اختلاف اس میں ہے کہ زمین میں دفن کر کے نظروں سے اُوجھل کیا جائے یا جلا کر۔

جہاد

(۲۲) ایک مقدس فریضہ ہے مگر اس کے معنی یہ ہیں اُصول کے لیے انسان اپنے اندر جذبۂ فدائیت پیدا کرے، یہاں تک کہ وہ اپنی ہستی اِن اصولوں کے لیے فنا کر دے۔

مندرجہ بالا اصول کی تشریح و اقتباسات

جو اُصول اوپر بیان کیے گئے ہیں ان کے ماخذ کا حوالہ دے دیا ہے۔ ان تمام کا ترجمہ پیش کرنا باعثِ طوالت ہے۔ البتہ شاہ ولی اللہؒ کی کتابوں کے چند اقتباسات جن سے شاہ صاحبؒ کے نظریات پر مجموعی طور پر روشنی پڑتی ہے، یہاں پیش کر دینے ضُروری معلوم ہوتے ہیں۔ اصل عبارتیں بخوفِ طوالت یہاں بھی نقل نہیں کی جا رہیں۔ صرف ان کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے، ترجمے سے پہلے یہ عرض کرنا ضُروری ہے کہ شاہ صاحب کے

زمانے میں وہ مشینیں اور کلیں جن کی بُنیاد پر اُنیسویں اور بیسویں صدی عیسویں میں سرمایہ داری نے خاص شکل اختیار کی اور وہ سوالات پیدا ہوئے جنھوں نے کمیونزم کو کامیاب بنایا، بلاشُبہ نہیں تھیں، مگر جاگیرداری خاص خاص منصبوں اور وظیفوں کی اجارہ داری نے اقتصادی توازن درہم برہم کررکھا تھا۔

ملکی تباہی کے اسباب

بادشاہ، امراء اور بالا دست حکام وہ چھوٹے بڑے جاگیردار تھے جو شاہانہ زندگی اور عیش پرستانہ رنگ رلیوں کے لیے کاشت کاروں کا خون چوستے تھے اور خانقاہ نشین پیشہ ور فقراء، سجادہ نشین اور نام نہاد علماء نے گویا کلیسائی نظام کا نقشہ ہندوستان میں کھینچ رکھا تھا، یہ دونوں طبقے محنت سے نا آشنا تھے، ملک کی دولت میں ان کے ذریعے کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ بقول شاہ صاحبؒ یہ ملک کے لیے بارِ گراں (یعنی ملک پر بوجھ) تھے۔

چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ ''مبحث الارتفاقات'' میں ''باب سیاست المدنیہ'' کے آخر میں آپ فرماتے ہیں:

''اس زمانے میں بربادی ملک کا سبب زیادہ تر دو چیزیں ہیں:

(۱) خاص طبقے اس کے عادی ہو گئے ہیں کہ کچھ کیے دھرے بغیر اپنے خاص خاص امتیاز کی بناء پر رقم بٹورتے ہیں، مثلاً اس لیے کہ وہ قاری اور عالم ہیں یا ان کا تعلق شعراء، سجادہ نشینوں اور فقراء کے اس حلقے سے ہے جس کو بادشاہوں کی طرف سے عطیے اور وظیفے ملتے رہتے ہیں یا اسی قسم کی دریوزہ گری (گداگری) اور بھیک کا کوئی ڈھنگ نکال کر خزانۂ شاہی سے رقمیں وصول کرتے ہیں اور ملکی دولت کے وسیع دامن کو تنگ کرتے رہتے ہیں ان کا مقصود ملک کی کوئی خدمت کرنا نہیں، بلکہ رقمیں حاصل کرنا ہوتا ہے اور اپنا ذریعہ معاش فراہم کرنا ان کا نصب العین ہوتا ہے ان مہذب مفت خوروں کا ایک گروہ جاتا ہے اور دوسرا گروہ آتا ہے اس طرح باشندگان ملک کی زندگی تنگ کررہے ہیں اور مُلک کے لیے بُوجھ بنتے رہتے ہیں۔

(۲) کاشت کاروں، سوداگروں اور دست کاروں پر بھاری بھاری ٹیکس مقرر کیے جاتے ہیں اور ان کے وصول کرنے میں انتہائی سختی سے کام لیا جاتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وفادار رعایا بھی بغاوت پر اُتر آتی ہے جس کو دور کرنے کے لیے جبر و تشدد سے کام

لینا پڑتا ہے اور بے انتہا فوجی طاقت صرف کرنی پڑتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک کی فلاح و بہبود اس میں ہے کہ ٹیکس کم سے کم ہوں اور دفاع پر بقدرِ ضرورت صرف کیا جائے"۔(3)

اقتصادی حالات کا اثر روحانی ترقی پر

برصغیر ہندو پاک اپنی اس خصوصیت پر ہمیشہ فخر کرتا رہا ہے کہ اس کی تہذیب و سیاست کبھی مذہب اور خدا پرستی سے بیگانہ نہیں ہوئی۔

ہندوستان کے بلند مرتبہ پیغمبر حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ جن کو تاریخ نے آج تک بھلائے رکھا ہے اس خصوصیت کے آئینہ دار ہیں۔ وہ عالم دین روحانیت اور فلسفۂ اخلاق کے بہترین ماہر ہیں، یہاں تک کہ ان کے جاننے والے اُن کو "شاہ" کا لقب دیتے ہیں جو روحانی بزرگوں کو ازراہِ عقیدت دیا جاتا ہے، لیکن اس عالم دین اور روحانی پیشوا کا نظریہ یہ ہے کہ وہ تباہی اور بدحالی جو مذہبی نقطۂ نظر سے سوسائٹی میں پائی جاتی ہے اس کا بڑا سبب یہی اقتصادی بحران ہے جس نے سرزمین ہند کو پُر شور بنا رکھا ہے۔

اس مذہبی رہنما کا یہ فیصلہ برصغیر کے خاص حالات کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس کا نظریہ یہ ہے کہ عالم انسانیت میں ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے کہ اقتصادی عدم توازن نے مذہب کے سربفلک قلعوں کو مسمار کیا ہے اس لیے سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح، مذہبی و اخلاقی اصلاح اور روحانی کمالات کے لیے سب سے پہلی سیڑھی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ مذہبی بادشاہ (شاہ ولی اللہؒ) سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح کو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا اہم جزو قرار دیتا ہے، چنانچہ اپنی مشہور تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں ذرائع معیشت پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی حالت یہ تھی کہ عیش و عشرت اور حد سے بڑھے ہوئے شاہانہ تکلفات کا مرض (جس نے ملک اور قوم کو اقتصادی عدم توازن کی تباہیوں میں مبتلا کر رکھا تھا) ایران اور روم وغیرہ میں وبا کی طرح پھیلا ہوا تھا،

پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے دل میں القاء کیا کہ وہ اس مرض کا ایسا علاج

کرے کہ نہ صرف مرض ختم ہو بلکہ زہریلا مادہ بھی فنا ہو جائے جس کی وجہ سے یہ مرض پیدا ہوا ہے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اسباب و وجوہات پر غور فرمایا جن سے اس مرض کے جراثیم نشوونما پا رہے تھے، پھر ایک ایک مرض کی تشخیص کر کے ان کی مُمانعت فرمادی"۔(4)

یہی مضمون ایک دوسرے موقع پر بھی بیان کیا گیا ہے، وہ اگر چہ کسی قدر طویل ہے، مگر موضوع کی اہمیت اس طوالت کو جائز قرار دیتی ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت (یعنی ساتویں صدی عیسوی میں) ایران اور روم کی سلطنتیں عُروج پر تھیں، مگر اقتصادی عدمِ توازن نے ان کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں، حضرت شاہ صاحبؒ ان ہی دو سلطنتوں کی تاریخی مثال سے اقتصادی خرابیوں کا تجزیہ کرتے ہیں اور مشاہدے کے لیے اپنے زمانے کے بادشاہوں کی مثال پیش کرتے ہیں۔

برصغیر کی اقتصادی تباہ حالی اور اس کی وُجوہات

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

"ایران اور روم کی سابق تاریخ ہمارے لیے واضح مثال ہے اور جو کچھ تم اپنے ملک میں دیکھ رہے ہو اس سے ایران اور روم کی حالت کا اندازہ کرلو"۔(5)

چنانچہ ایران و روم کی تعیشانہ حالت بیان فرماتے ہیں:۔

"دولت و ثروت کے ساتھ فلسفہ اور سائنس کی تحقیقات نے ایجادات کا راستہ کھولا، نئی نئی صنعتیں رُونما ہوئیں اور ملک اپنے اس دور میں تمدُّن کے لحاظ سے اعلیٰ درجے تک پہنچ گیا، لیکن بدقسمتی سے اہل ثروت اور حکمران طبقے میں عیش، فیشن اور اقتدار پرستی ایک دوسرے کے مقابلے میں تفاخُر (بڑھ چڑھ کر رہنے) کا مرض پیدا ہو گیا، یہاں تک کہ اس پر فخر ہونے لگا کہ کس کا تاج زیادہ قیمتی ہے اور کس کے تاج میں زیادہ جواہر ٹکے ہوئے ہیں، اربابِ حکومت کے اس ٹھاٹھ نے سوسائٹی کا مزاج بگاڑ دیا، نئے نئے فیشن، امیرانہ شان و شوکت اور شاہانہ تکلُّفات نبھانے کے لیے ہر صاحبِ اقتدار اپنے ماتحتوں کو لوٹنے لگا۔ زمیندار اور جاگیردار کاشت کار کا خُون چوسنے لگے اور جو مزدوروں پر اختیار رکھتے تھے، انہوں نے غریب مزدور کو نوچنا شروع کر دیا اب اس

بااقتدار طبقے کی تمام عملی اور فکری قوتیں ترقیِ ملک و دولت کی بجائے عیش و عشرت، شاہانہ تکلّفات، نفع اندوزی اور استحصال بالجبر (زبردستی چھیننے) پر صرف ہونے لگیں اور ماتحت طبقہ اتنا گر گیا کہ اس کی زندگی کھیت جوتنے والے بیلوں اور بوجھ اُٹھانے والے گھوڑوں کی مانند ہوگئی، زرکشی اور زراندوزی کے لیے نئے نئے قانون ایجاد ہوئے۔

مزدور اور کسان طبقہ اگر اُن سے سرتابی کرتا (یعنی ان کی حکم عدولی کرتا) تو مجرم بن کر طرح طرح کی سزاؤں میں مبتلا ہوتا اور اگر سزاؤں سے بچنا چاہتا تو لامحالہ بار بردار گھوڑوں اور گدھوں کی زندگی پر مجبور ہوتا، یہ دونوں طبقے اپنے اپنے حالات میں ایسے غرق ہو گئے کہ پیدائش انسان کا حقیقی مقصد کسی کے سامنے بھی نہیں رہا، ایک طبقے کو حد سے بڑھے ہوئے عیش اور دولت کی چمک دمک نے اندھا کر دیا اور دوسرا طبقہ پیٹ کی فکر میں ایسا سرگرداں ہوا کہ فکرِ مستقبل کی صلاحیت بھی ختم کر بیٹھا۔ اس صورتحال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ تمام دولت سمٹ کر چند افراد کے ساتھ مخصوص ہوگئی جن کا سربراہ بادشاہ تھا۔

اقتصادی عدم توازن اور طبقہ اعلیٰ کی شان و شوکت اور عیش پرستی نے ایک تیسرا طبقہ پیدا کر دیا، یہ تن آسان، آرام طلب اور سرکار پرست خوشامدیوں کا طبقہ تھا، جو بادشاہ اور شاہ پرستوں کے گرد جمع ہو گیا تھا اور مختلف عنوانات سے رقمیں وصول کرتا رہتا تھا، ان میں بہت سے صاحبِ فن اور اہلِ علم بھی ہوتے تھے، وہ فن و علم کے نام پر روپیہ وصول کرتے تھے، مگر ان کا مقصد ملک کی خدمت نہیں، بلکہ اپنی ذاتی اغراض و ذاتی جاہ و جلال اور ذاتی اقتدار حاصل کرنا ہوتا تھا۔ کوئی اس نام سے روپیہ وصول کرتا تھا کہ وہ فن سپاہ گری کا ماہر ہے، بہترین جرنیل یا کمانڈر ہے، کوئی اپنے علم و ہنر اور اپنی سیاست دانی کے نام پر روپیہ وصول کرتا تھا، خانقاہ نشینوں کی ایک جماعت تھی جو تقدس کے نام پر وظیفے حاصل کرتی تھی، ایک جماعت فنون لطیفہ و ادب و شاعری کے نام پر رقمیں اینٹھتی (وصول کرتی) تھی کہ شانِ خسروانہ (بادشاہ کی شان) یہی ہے کہ فنونِ لطیفہ کے ماہرین کی قدر کرتے ہیں۔

بادشاہ یا اُمراء کو خوش کرنا، خوش گپیوں سے گرمیِ مجلس پیدا کرنا ایک فن قرار دے دیا گیا تھا اور اس فن کے ماہرین طرح طرح کے ڈھونگ رچا کر روپیہ وصول کرنے لگے تھے۔ شاہانہ آداب، درباری آداب، ایک خاص فن بن گیا اور ایک گروہ اسی نام پر رقمیں وصول کرنے لگا، یہ تمام جماعتیں جن کو لازمۂ تمدّن مان لیا گیا تھا، درحقیقت مُفت خوروں کے گروہ تھے جو ملک اور قوم کی خدمت کی بجائے اپنی تمام صلاحیتیں مُٹھی بھر شاہ

پرستوں کی اغراض اور ان کی خوشنودی کے لیے صرف کرتے تھے، ملک اور ملک کے مزدوروں اور کسانوں پر بار بنتے جا رہے تھے، اس طرح خُدا کی تمام مخلوق دن بدن افلاس اور تباہ حالی میں مبتلا ہو کر روحانی فلاح و بہبود سے بھی محروم ہو رہی تھی، یہاں تک کہ پورے ملک میں بھی کوئی شخص ایسا نہیں ملتا تھا جس کو آخرت کی فکر ہو، اللہ تعالیٰ جو تمام مخلوق کا پروردگار ہے، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، تا کہ وہ روحانی اصلاحات کے ساتھ اقتصادی تباہ حالی بھی ختم فرمائیں اور معیشت کے ایسے اُصول تلقین فرمائیں جن سے اقتصادی امراض کے زہریلے جراثیم کا قلع قمع ہو جائے"۔(6)

حضرت شاہ صاحبؒ اس مفہوم کو ذہن نشین کرانے کے لیے کہ اقتصادی حالات کا روحانی اصلاحات پر کیا اثر پڑتا ہے، ایک مثال پیش فرماتے ہیں، اس مثال سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ حضرت شاہ صاحبؒ جس حکومت کی حمایت کر سکتے ہیں اس کا نقشہ کیا ہے آپ فرماتے ہیں:

"ایک ایسی قوم فرض کرو جس میں ملوکیت نہ ہو، شاہانہ شان و شوکت اور عیش پرستی کے لوازمات سے محفوظ ہو، ہر شخص اقتصادی طور پر آزاد ہو اور ٹیکسوں کے بوجھ سے اس کی کمر دوہری نہ ہوئی ہو، ایسی قوم کو یہ فراغت میسر ہو گی کہ وہ دین و ملت کے کام انجام دے سکے اخلاقی اور روحانی ترقی حاصل کر سکے، لیکن اگر اس کی گردن پر ملوکیت، شاہ پرستی اور سرمائے کا بھوت سوار ہو جائے تو اس کے ہوش و حواس گم ہو جائیں گے اور وہ انسانی شرف و عظمت سے گر کر چوپاؤں کی زندگی پر مجبور ہو جائے گی، جن کو رات دن پیٹ کا فکر رہتا ہے اور پھر بھی یہ جہنم بھرنے نہیں پاتا۔"(7)

عوام کی خوشحالی کا اُصول

مذہب کی روشنی میں شاہ صاحبؒ کی رائے یہ ہے کہ سونے چاندی کے انباروں سے زیادہ خطرناک وہ طرزِ معاشرت ہے جو امیر و غریب میں امتیاز قائم کر کے غریب کے دل میں سرمایہ داری کی ہوس اور شاہ پرستی کا شوق پیدا کرتی ہے، سونے چاندی کے برتن، زرق برق ریشمی لباس، فیشن اور تکلّفات، دولت مندوں کے دماغوں میں کبر و غرور اور تصورِ برتری پیدا کرتے ہیں، ناداروں کے دلوں میں حرص و طمع کی وہ خواہش پیدا کرتی ہے جو

ان کو زیادہ رشوت ستانی، چوری، خیانت، استحصال بالجبر اور عصمت فروشی وغیرہ پر آمادہ کر دیتی ہے، غرض سماجی زندگی کے بیش قیمت تکلّفات، سرمایہ داری اور شاہ پرستی کے وہ زہریلے جراثیم ہیں کہ جب تک نظام ان کی اجازت دیتا رہے گا، سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں گی، دوسری طرف نادار اور حریص لوگوں میں جرائم کی عادت بڑھتی رہے گی۔ شاہ صاحبؒ ایک طبقے کی ایسی خوشحالی کو جو ان تکلّفات سے مرصع (مزین) ہو جس سے اقتصادی توازن بگڑے ''رفاہیتِ بالغہ'' سے تعبیر کرتے ہیں اور سوسائٹی کے لیے اس کو بدترین جُرم اور اس کے خلاف جنگ کو مُقدس جہاد قرار دیتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ کی تصانیف ''رفاہیتِ بالغہ'' کی مذمت سے بھری ہوئی ہے۔

جہاد

تحریک شاہ ولی اللہؒ کے عملی پروگرام میں ''جہاد'' کا لفظ استعمال کیا گیا اور گزشتہ صدی میں یورپ کے اربابِ صحافت اور مصنفین لفظ ''جہاد'' کو اس قدر بدنام کر چکے ہیں کہ ایک سنجیدہ دماغ بھی اس لفظ سے اس کے اسلامی تصور تک نہیں پہنچ سکتا، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تشریحات کے ضمن میں جہاد کے متعلق بھی حضرت شاہ صاحبؒ کے نظریہ کی وضاحت کر دی جائے۔

لُغت کے لحاظ سے جہاد کے معنی ہیں ''زیادہ سے زیادہ درجے کی کوشش'' یہ کوشش اگر ذاتی اغراض سے علیحدہ ہو کر صرف حق کی فتح اور صداقت کی سربلندی کے لیے ہو تو اس کے مبارک اور مسعود ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم ذاتی اغراض تو درکنار گروہی یا نسلی اغراض کا گرد و غُبار بھی دامنِ جہاد پر برداشت نہیں کرتا۔ قرآن حکیم کی رو سے ہمہ گیر حق و صداقت، انسانی شرف و عظمت اور اعلیٰ اخلاق کے نام پر جو جدوجہد ہو وہ اسی وقت جہاد قرار دی جا سکتی ہے جبکہ نہ گروہی یا نسلی اقتدار کا تصور سامنے ہو اور نہ فرقہ پرستی اور دھڑے بندی کی کوئی شکل کسی فتنہ و فساد کو پیدا کر سکے۔

وہ اپنی ذاتی اغراض اور اپنے نفس کی خواہش سے یہاں تک دستبردار ہو چکا ہو کہ بہادری کی نمائش اپنے قبیلے یا خاندان کی عزت یا شُہرت، سیاسی دُنیا میں نام آوری یا

صفحات تاریخ میں تذکرہ کا تصور بھی اس کے دماغ میں نہ ہو، اس جدوجہد (جہاد) کے وقت ایک فریق کو شکست دے کر ختم کر دینے کا جذبہ یقیناً کارفرما ہوگا، مگر یہ جذبہ ہر قسم کی خودغرضی اور تنگ نظری سے بالکل پاک ہوگا اور اس وقت ہوگا جب کہ اصلاح کی تمام کوششیں ختم ہو چکی ہوں اور انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کی حفاظت کے لیے اس آپریشن کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا ہو اس بنا پر اس جذبے کو پاک جذبہ اور اس عداوت کو مقدس عداوت کہا جائے گا۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ جن مختصر اور جامع الفاظ میں ''جہاد'' کی تعریف کر رہے ہیں وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ شاہ صاحبؒ کے الفاظ یہ ہیں کہ:

> ''ایک مقدس عداوت جو ذاتی اغراض اور نفسانی خواہشات سے بالکل پاک صرف عمومی مفاد اور انسانیت کے اعلیٰ مقاصد اور بلند تر مصالح کے لیے ہو قتل کرنے یا قید کرنے کی صورت میں اس پاک عداوت کا پرشوکت ظہور ''جہاد'' ہے''۔ (8)

عداوت اور دشمنی کے ساتھ پاک کا لفظ بہت ہی اجنبی ہے، مگر جہاد کے لئے یہی اجنبی صفت لازمی شرط ہے، کیونکہ اپنی جان دینے یا دوسرے کی جان لینے کے لیے کسی بھی ذاتی غرض یا کسی بھی نفسانی خواہش کی ذرہ بھر پلیدی کی آمیزش ہوگی تو یہ جہاد نہیں، بلکہ جہالت، وحشت اور ظلم ہوگا (معاذ اللہ) شاہ صاحبؒ کا نظریہ یہ ہے کہ جہاد کے وقت ایک حق پرست اپنے آپ کچھ نہیں ہوگا، وہ جو کچھ ہوگا، مقاصدِ حق کا آلۂ کار ہوگا، حق و صداقت کا جو تقاضہ ہو وہ اس کی عین تمنا اور آخری آرزو ہوگی اور اسی کی تکمیل کے لیے وہ اپنا سب کچھ قربان کر رہا ہوگا۔

شاہ صاحبؒ کا عقیدہ ہے کہ خودغرض انسانوں کی اغراض پرستی جب اجتماعی شکل اختیار کر کے ملک کے امن و امان، باشندگانِ ملک کے اطمینان، آرزو، کاروبار، خوشحالی، آزادیٔ رائے وغیرہ حقوقِ انسانیت اور حقوقِ شہریت پر ڈاکے ڈالنے لگے تو ایسی بے رحم، ظالم و جابر طاقت کا ختم کر دینا حق و صداقت کا تقاضہ اور عدل و انصاف کا مطالبہ ہوگا، کیونکہ یہ بے رحم ظالم و جابر طاقت سارے انسانوں کے لیے سرطان جیسا مرض ہے، ہر ایک ہمدردِ انسانیت کا فیصلہ یہی ہوگا کہ اس کا آپریشن کر دیا جائے، ورنہ ساری انسانیت

موت کے گھاٹ اُتر جائے گی۔ لہٰذا ایک حق پرست کا مذہبی اور اخلاقی فرض ہوگا کہ اس سرطان کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کے لیے جان کی بازی لگا دے۔

اسلام کی تعلیم اور شاہ صاحبؒ کے عقیدے کے مطابق جہاد کا مقدّس فرض پورے تقدُّس کے ساتھ وہی پارٹی انجام دے سکتی ہے، جس کی تربیت خاص مقاصد کے لیے خاص طور پر کی گئی ہو، جس کا ہر ایک فرد اپنی ذاتی اغراض ختم کر کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنے زندگی وقف کر چکا ہو۔

اس موقع پر عرض کر دینا بھی مناسب ہے کہ جہاد کی اصل قوت ضبطِ نفس، صبر و استقامت، ذوقِ فنا اور وہ جذبہ ہے جو مصیبت کو راحت اور موت کو جامِ خوشگوار بنا دے۔

تحریک کا نصب العین: ہمہ گیر انقلاب

گزشتہ ابواب میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے روم اور ایران کی جابرانہ شہنشاہیتوں اور ان کے ظالمانہ نظام کی وجہ سے عوام کی اقتصادی بدحالی کی مثال میں اپنے زمانے کے نظامِ حکومت کو پیش کیا تھا اور ایسے نظام کو ختم کر دینا انبیاء علیہم السلام خصوصاً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد قرار دیا تھا۔ یہاں آپ حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریر کے ایک مختصر اقتباس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

> ''تباہ حال شہر جن پر درندہ صفت انسانوں کا تسلط ہو اور اُن کو اپنی حفاظت اور دفاع کی پوری طاقت حاصل ہو۔ یہ (ظالم و جابر پارٹی) جسدِ انسانیت کے لیے سرطان (کینسر) ہے کہ انسان اس وقت تک تندرست نہیں ہو سکتا جب تک اس سرطان کو کاٹ کر نہ پھینک دیا جائے۔ جو طبیب بھی اس انسان کے مزاج کو درست کرنے اور اس کی صحت بحال کرنے کی طرف توجہ کرے گا، اس کے لیے ضروری ہوگا کہ پہلے اس سرطان کا پورا آپریشن کر ڈالے، تھوڑی سی برائی کو عمل میں لانا جبکہ اس کا نتیجہ خیر کثیر اور بہت بڑی بھلائی ہو، واجب اور ضروری ہو جاتا ہے''۔(9)

فک کل نظام ۔ پروگرام

ممکن تھا کہ اس زمانے کے جنگجو سرداروں کی طرح شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ بھی تلوار

ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو جاتے اور فوج بھرتی کر کے اِس شہر پر قبضہ کر لیتے یا کسی جنگجو حکمران کے ساتھ مل کر اس کو تقویت پہنچاتے، مگر اس طرح وہ ''ہمہ گیر انقلاب'' جو پارٹی کا نصب العین تھا پورا نہ ہوتا، بلکہ آپ بھی کسی حکمران کا ضمیمہ بن جاتے۔ نصب العین کی تکمیل اسی وقت ہوسکتی تھی، جب رائے عامہ آپ کے انقلابی نظریات کو اپنا لیتی، اس کے لیے جنگ و جہاد سے پہلے تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی، لہٰذا پارٹی کا پہلا پروگرام یہی قرار دیا گیا اور اس مقصد کے لیے ملک میں مختلف مراکز قائم کیے گئے۔

حوالہ جات وحواشی:

(1) البدور البازغہ (عربی) ص ۴۴، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد۔

(2) مندرجہ بالا پیش کردہ ۲۲ اُصول کے ماخذ درج ذیل کتب ہیں:

(۱۔ حجۃ اللہ البالغہ: باب سیاست المدینہ۔ البدور البازغہ مبحث الارتفاق الثالث، الخیر الکثیر ۲۔ حجۃ اللہ البالغہ، باب ابتغاء الرزق ۳۔ ایضاً ۴۔ حجۃ اللہ البالغہ، باب سیاست المدنیہ، باب الرُسوم السائرہ بین الناس ۵۔ حجۃ اللہ البالغہ، باب ابتغاء الرزق ۶۔ ایضاً ۷۔ حجۃ اللہ البالغہ باب اقامت الارتفاقات و اصلاح الرُسوم و باب ضبط المبہم ۸۔ حجۃ اللہ البالغہ باب البیوع المنہی عنہا ۹۔ حجۃ اللہ البالغہ باب الارتفاق الرابع و باب البیوع ۱۰۔ ازالۃ الخفاء جلد دوم عہد فاروق اعظم ۱۱۔ حجۃ اللہ البالغہ باب اصل الدین واحد ۱۲۔ البدور البازغہ: فصل حقائق الارتفاقات اور مقالہ ثالثہ وغیرہ)

(3) حجۃ اللہ البالغہ: باب سیاسۃ المدینہ، مبحث الارتفاقات۔

(4) حجۃ اللہ البالغہ: ابواب ابتغاء الرزق ص ۹۸ ج ۲

(5) حجۃ اللہ البالغہ، باب اقامۃ الارتفاقات

(6) ایضاً

(7) حجۃ اللہ البالغہ جلد اول باب اقامۃ الارتفاقات و اصلاح الرُسوم

(8) الخیر الکثیر صفحہ ۱۰۷

(9) حجۃ اللہ البالغہ باب الجہاد جلد دوم صفحہ ۱۵۷

www.rahimia.org

مقالہ نمبر(۱۶)

﴿انسانی اجتماعیت اور اقتصادیات﴾

شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ کے اساسی اُصول پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا مطالعہ کیا جائے، تو یہ امر واضح ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات نے جس طرح انسان کی باطنی استعدادوں کے تزکیے اور ان کی اصلاح کے بعد اسے اس قابل بنایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رؤیت (دیدار) کا اہل ہو سکے۔ اسی طرح انہوں نے تہذیب جوارح (اصلاحِ اعضاءِ انسانی) کا فرض بھی ادا کیا۔ شاہ صاحبؒ کی رائے میں نبوت کا مقصد انسان کی پوری زندگی کی اصلاح اور تہذیب ہے اور نبوت ''حَسَنَةً فِي الدُّنْيَا'' اور ''حَسَنَةً فِي الْآخِرَةِ'' دونوں پر حاوی اور دونوں کی نگران ہے۔

نبوت کی اگر یہ تعریف سمجھ میں آ جائے تو نبوت کے متعلق ابن خلدون نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس کا غیر صحیح ہونا صاف نظر آ جائے گا۔ ابن خلدون کی رائے یہ ہے کہ انسان کو نبوت کی ضرورت فقط اس زندگی کے بعد جو آخرت کی زندگی ہے اس کے امور معلوم کرنے کے لیے پڑتی ہے۔ جہاں تک اس دنیا کی معیشت کا تعلق ہے انسان اپنے ان معاشی نظاموں کے لیے نبوت کا محتاج نہیں۔

نبوت کے متعلق ابنِ خلدون کے اس نظریئے نے عربوں کی ذہنیت پر بہت بُرا اثر ڈالا ہے۔ عرب ابن خلدون سے بڑھ کر اپنے ہاں کوئی اور حکیم نہیں پاتے، اور ابن خلدون کا یہ حال ہے کہ وہ نبوت کو محض آخرت کی گتھیاں سُلجھانے کے لیے وقف مانتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ دنیاوی ترقی کے لیے انبیاء کی ضرورت ہی نہیں، لامحالہ ابن خلدون کا یہ فکر انسان کو دنیا کے معاملات میں انبیاء کی تعلیمات سے مستغنی کر دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ افراد اور قوم کے حق میں کبھی خوش آئند نہیں ہو سکتا، چنانچہ نبوت کو صرف امورِ

اُخروی کا مُداوا سمجھنے سے یہ ہوا ہے کہ آج کے عرب دنیاوی امور کو حل کرنے کے لیے باسانی یورپی حکماء کے افکار اور ان کے پراپیگنڈے کے شکار ہوجاتے ہیں۔ لیکن شاہ صاحبؒ نے نبوت کی جو تشریح کی ہے اس کا فائدہ یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کی حکمت پڑھنے والا اِس مصیبت سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

شاہ صاحبؒ نے انسان کے اعضائے رئیسہ کے ابتدائی لطائف کے بعد اس میں لطیفہ جوارح (انسانی اعضاء) بھی مانا ہے اس لطیفہ جوارح کو انسانی زندگی کی بُنیاد قرار دینے سے شاہ صاحبؒ نے ایک اور اہم مشکل کو بھی حل کر دیا ہے۔ عام طور پر تصوُّف اور فلسفہ کی ابتدا اخلاق سے کی جاتی ہے۔ گو انسان کی حیوانی زندگی کے لیے اقتصادی ضروریات بیشک ضروری مانی جاتی ہیں، لیکن انسانیت کی اعلیٰ زندگی کا (جو تصوُّف اور فلسفہ کا موضوع ہے) اقتصادی ضروریات کے ساتھ براہِ راست تعلق تسلیم نہیں کیا جاتا۔ انسانی زندگی کو اس طرح سمجھنے کا اثر یہ ہوا کہ ہماری سیاست بالکل کھوکھلی ہوگئی ہے۔ ہمارے ہاں کے عقل مند اور وہ لوگ جو زیادہ بااخلاق مانے جاتے ہیں، سیاسی سرگرمیوں سے الگ رہنا انسانیت کا کمال سمجھتے ہیں، چنانچہ ان کے نزدیک سیاست جو زندگی کے روزمرہ کے کاموں کو سُلجھانا اپنا مقصد قرار دیتی ہے ایک ادنیٰ اور ناقابلِ التفات چیز ہے۔

اس کے برعکس شاہ صاحبؒ نے ''حجتہ اللہ البالغہ میں متعدد مواقع پر اس امر کی وضاحت کی ہے کہ انسان کی اخلاقی زندگی کا دارومدار بہت حد تک اس کی اقتصادی زندگی کے حُسنِ انتظام پر ہوتا ہے، چنانچہ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

> ''انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت بالکل برباد ہو جاتے ہیں، جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کیا جائے اور وہ گدھے اور بیل کی طرح صرف روٹی کے لیے کام کریں جب کبھی انسانیت پر ایسی مصیبت آتی ہے تو خُدا تعالیٰ انسانیت کو اس مصیبت سے نجات دینے کے لیے کوئی نہ کوئی سبیل نکالتا ہے، اور اس کا اپنے کسی بندے کو الہام بھی کرتا ہے فرعون کی ہلاکت، قیصر و کسریٰ کی تباہی اِسی اُصول پر نبوت کے لوازم میں سے شمار ہوتی ہے''۔(1)

اگر انسانی زندگی کو اس کی اقتصادی ضروریات سے لے کر اس کی اعلیٰ اور ترقی یافتہ شکل

تک ایک ہی سلسلے کی کڑیاں سمجھی جائیں تو اس انسانی زندگی کے لیے جو بھی فلسفہ بنے گا وہ مکمل ہوگا اور تمام زندگی کو بحیثیت مجموعی ایک سمجھ کر اس کے لیے نظام مرتب کرے گا، اس لیے انسان کی اجتماعی زندگی کے لیے ایک ایسا اقتصادی نظام ہونا چاہیے، جو اس کی اقتصادی ضروریات کو پورا کرے۔ چنانچہ جب انسان اپنی حیوانی زندگی کی ضروریات سے مطمئن ہوں گے اور ان کے پاس روٹی کپڑے کے دھندوں سے کچھ فاضل وقت بچے گا، تو پھر کہیں وہ اپنی اعلیٰ تر استعدادوں اور دوسرے بلند لطائف کی تکمیل کی طرف متوجہ ہو سکیں گے۔ ان حالات کے پیشِ نظر اگر یہ کہا جائے کہ ''جو نظامِ فکر یا فلسفہ، اقتصادی زندگی کی ضرورتوں کو نظر انداز کرتا ہے، وہ فلسفہ نہ تو مکمل ہے اور نہ صحیح'' تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔

انسانیت جب کبھی اس قسم کی اقتصادی مصیبت میں گرفتار ہو جاتی ہے تو اس کو نجات دینے کے لیے کبھی تو انبیاء کے ذریعے الہام خُداوندی صورت پذیر ہوتا ہے اور کبھی یہ الہام کسی صدیق اور حکیم کو اپنے اظہار کا واسطہ بناتا ہے، چنانچہ ان کی کوششوں سے جب اجتماع انسانی کا یہ اقتصادی نظام درست ہو جاتا ہے تب کہیں جا کر انسانیت کے سامنے اپنے اخلاق کی تکمیل کے لیے راستہ کھلتا ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں اگر انسان کے اخلاق اس طرح پایہ تکمیل کو پہنچیں تو مرنے کے بعد اس کو قبر اور حشر کی مصیبتوں سے نجات مل جاتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ حیات بعد الموت میں انسان کا جنت کی نعمتوں سے مستفید ہونا، دراصل اسی تکمیلِ اخلاق کا نتیجہ ہے جو انسان دنیا کی اس زندگی میں کرتا ہے، اب حیاتِ انسانی کا ایک درجہ تو دنیا کی یہ زندگی ہے، انسان اس میں اپنے اخلاق کی تکمیل کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہو کر موت کی راہ طے کر کے جنت میں پہنچتا ہے۔ یہ اس کی زندگی کا دوسرا درجہ ہے، یہاں پہنچ کر اس کی ترقی کا قدم رُک نہیں جاتا، وہ اَور آگے بڑھتا ہے اور زندگی کے تیسرے درجے میں قدم رکھتا ہے۔ یہاں اسے ''رؤیت ربُّ العالمین'' کی سعادتِ کبریٰ سے سرفراز ہونے کی صلاحیت حاصل ہوتی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ کس طرح انسانی زندگی کی ابتدا سے لے کر اس کے آخری درجے تک اس حکمت کا سلسلہ کہیں نہیں ٹوٹتا، اور شاہ صاحبؒ کا نظامِ فکر اتنا جامع، عالمگیر اور ہمہ گیر ہے کہ وہ انسان کی ابتدائی ضروریات سے (جنہیں ہم حیوانی زندگی کے لوازم کہتے

ہیں) لے کر انسانیت کی ترقی کی آخری اور ارفع ترین منزل تک جتنے ارتقائی مراحل اور مقامات ہیں ان سب کو اپنے اندر لے لیتا ہے۔ اب اگر اس نظامِ فکر کی اساس، نبوت کو مان لیا جائے اور جہاں نبوت نہ ہو وہاں انبیاء کے پیروؤں میں سے صدیق اور حکیم یہ کام کریں، تو اس تشریح کے بعد نبوت انسانیت کے لیے کس قدر فطری چیز بن جاتی ہے اور جیسا کہ عام طور پر غلطی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ نبوت کا کام صرف اس زندگی کے بعد کے مسئلوں کو ہی حل کرنا تھا اس کی بھی تردید ہو جاتی ہے، پھر نبوت کی تعلیم صحیح معنوں میں ''حَسَنَةً فِي الدُّنْيَا'' اور ''حَسَنَةً فِي الْآخِرَةِ'' کی حامل بھی بن جاتی ہے۔ یہ ہے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی حکمت اور ان کے فلسفے کی روح، جس کا ہم نے تعارف کرایا ہے۔

حوالہ جات:

(1) حجۃ اللہ البالغہ: باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم

www.rahnia.org

ضروری یادداشت از حاصل مطالعہ

www.rahimia.org

www.rahimia.org

شعور و آگہی

امام عبید اللہ سندھیؒ

www.rahimia.org

رحیمیہ مطبوعات

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ، شاہراہِ فاطمہ جناح، لاہور